ISSN 0970-180X

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

معاملات میں مشورہ کیجئے ____

مشورہ کرنا اپنے آپ کو نقصان سے بچانا ہے

دسمبر ۱۹۸۷

شمارہ ۱۳۳

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	40/-
تذکیر القرآن جلد اوّل	80/-
الاسلام	25/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہور اسلام	25/-
احیاء اسلام	20/-
پیغمبر انقلاب	30/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
صراط مستقیم	25/-
اسلامی زندگی	20/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدید دین	4/-
اسلام دین فطرت	4/-
تعمیر ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	6/-
عقلیات اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-

ایمانی طاقت	4/-
اتحاد ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	5/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
حقیقت حج	4/-
آخری سفر	4/-
اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیات طیبہ	4/-
باغ جنت	4/-
نار جہنم	4/-
تبلیغی تحریک	12/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عظمت قرآن	25/-

Muhammad: The Prophet of Revolution	50/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad: The Ideal Character	4/
Man Know Thyself	4/-

مکتبہ الرسالہ سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

تبدیلی کا نظام

قرآن میں اہل ایمان کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ گناہوں سے اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں، اور جب انھیں غصہ آتا ہے تو وہ معاف کر دیتے ہیں (وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ، الشوریٰ ۳۷)

اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ اہل ایمان رد عمل کی نفسیات کا شکار نہیں ہوتے کہ وہ برائی کا جواب برائی سے دیں اور جب کوئی شخص غصہ دلانے والا کام کرے تو غصہ ہو کر اس کے ساتھ بھی وہی کرنے لگیں جو اُس نے اِن کے ساتھ کیا ہے۔ بشری تقاضے کے تحت انھیں دوسرے کی غلط بات پر غصہ تو ضرور آتا ہے، مگر جب وہ اس کو لوٹاتے ہیں تو غصہ نہیں لوٹاتے، بلکہ غصہ کے جواب میں اسے معافی اور درگزر کا سلوک لوٹاتے ہیں۔

یہ عین وہی قانون ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنی پوری دنیا کا نظام قائم کر رکھا ہے۔ یہاں ہر چیز اس ڈھنگ پر بنائی گئی ہے کہ اس کو جو کچھ باہر سے ملے اس کو وہ اسی طرح اگل نہ دے بلکہ اپنے اندرونی نظام کے تحت اس کو تبدیل کرے۔ وہ کمتر چیز کو بہتر چیز بنا کر خارج کرے۔

درخت کو زمین سے "مٹی" ملتی ہے۔ مگر اس کو وہ پتی اور پھول اور پھل میں تبدیل کرکے باہر لاتا ہے۔ اس کو بیرونی فضا سے کاربن ڈائی آکسائڈ دیا جاتا ہے، مگر وہ اس کو اپنے اندر جذب کرکے باہر کی دنیا کو آکسیجن کا تحفہ عطا کرتا ہے۔ "گائے" اسی تبدیلی کا ایک زندہ کارخانہ ہے۔ وہ گھاس کھاتی ہے اور دودھ نکالتی ہے۔ وہ غیر دودھ کو دودھ میں تبدیل کرتی ہے:

The cow is a living factory which converts non-milk into milk.

خدا پرست انسان کو بھی اسی اصولِ فطرت پر رہنا ہے جس پر دنیا کی بقیہ چیزیں قائم ہیں۔ اس کو یہ کرنا ہے کہ دوسرے لوگ جب اس کے ساتھ برا سلوک کریں اور اس کی وجہ سے اس کے اندر غصہ اور نفرت اور انتقام بھڑک اٹھے تو وہ ان منفی جذبات کو مثبت جذبات میں تبدیل کرے۔ وہ برے سلوک کا جواب اچھے سلوک سے دے۔

ازالہ سبب

ایک حکیم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک تجربہ کار حکیم ہیں اور اپنے فن پر کامل عبور رکھتے ہیں۔ انھوں نے ایلوپیتھی اور طب یونانی کا تقابل کرتے ہوئے کہا کہ دونوں کے طریق علاج میں ایک بنیادی فرق ہے۔ ایلوپیتھی کا انحصار ازالۂ تکلیف پر ہے اور طب یونانی کا انحصار ازالۂ سبب پر۔ مثلاً ایک مریض آتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے سر میں درد ہے۔ اب ایلوپیتھی کا معالج اس کو اسپرین کی گولی دیدے گا جس کے استعمال سے درد بظاہر دب جائے گا۔ مگر یہ دبنا وقتی ہوگا۔ اس کی گولیاں وقتی طور پر کچھ ازالۂ تکلیف کر سکتی ہیں، مگر وہ درد کو مستقل طور پر ختم نہیں کرتیں۔

اس کے برعکس طب یونانی کے معالج کے سامنے یہی مریض آئے تو وہ دردِ سر کا سبب تلاش کرے گا۔ اگر وہ پائے گا کہ درد کا سبب پیٹ کی خرابی ہے تو وہ پیٹ کا علاج کرے گا نہ کہ براہ راست دردِ سر کا۔ مذکورہ حکیم صاحب نے ایلوپیتھی کے طریقہ پر سخت تنقید کی اور طب یونانی کے طریقہ کو صحیح اور فطری طریقہ قرار دیا۔ "کیوں کہ ازالۂ تکلیف کا طریقہ صرف وقتی ریلیف دیتا ہے، وہ مستقل شفا عطا نہیں کرتا"

اس کے بعد الرسالہ کا ذکر آیا تو حکیم صاحب نے اس کے "تعمیری پیغام" سے اتفاق نہیں کیا۔ انھوں نے کہا کہ مسلمان آج سنگین قسم کے مسائل میں مبتلا ہیں۔ وہ فوری توجہ کے مستحق ہیں۔ مگر آپ کے پاس مسلمانوں کے مسئلہ کا کوئی فوری حل نہیں۔ آپ صبر اور اعراض کی اور یک طرفہ طور پر شکایات کو ختم کر لینے کی باتیں کرتے ہیں۔ موجودہ حالت میں تو یہ بات محض ایک فلسفہ ہے وہ مسئلہ کا حل نہیں۔

میں نے حکیم صاحب سے کہا کہ آپ شخصی بیماری کے لیے ازالۂ سبب کے طریقہ کو مفید بتاتے ہیں، اور اجتماعی بیماری کے لیے ازالۂ تکلیف کے طریقہ کی وکالت کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس ہم شخصی اور اجتماعی دونوں قسم کے مسائل میں ازالۂ سبب کے طریقہ کو نتیجہ خیز سمجھتے ہیں۔ بس اس کے سوا ہمارے اور آپ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ آپ دہرا اندازِ فکر کو ختم کر دیں اور پھر ہمارے اور آپ کے درمیان کوئی فرق نہ ہوگا۔

ہر ایک کی کہانی

ایک بس میوات کے علاقہ سے گزر رہی تھی۔ وہ اسٹینڈ پر رکی تو کچھ مسافر بس کے اندر داخل ہوئے۔ ان میں ایک بوڑھی "میونی" بھی تھی۔ اپنے سر پر گٹھری لیے ہوئے وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی کہ کہاں جاکر بیٹھے۔ ایک مسافر نے ازراہ مذاق کہا: دیکھو، وہ سیٹ خالی ہے۔ وہاں جاکر بیٹھ جاؤ۔ یہ ڈرائیور کی سیٹ تھی۔ مگر میونی کو ڈرائیور کی سیٹ اور مسافر کی سیٹ کا فرق معلوم نہ تھا۔ وہ اطمینان کے ساتھ آگے بڑھی اور "خالی سیٹ" پر جاکر بیٹھ گئی۔

کچھ دیر کے بعد ڈرائیور اندر داخل ہوا۔ وہ اپنی سیٹ پر میونی کو دیکھ کر بولا: عورت، تو یہاں کیسے بیٹھ گئی۔ یہاں سے تو میں بیٹھ بس چلاؤں گا۔ میونی نے اپنی گٹھری سنبھالتے ہوئے نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا: میں تو چوکھی بیٹھی ہوں، تو کہیں اور سے چلالے۔

بس کے اعتبار سے دیکھئے، تو یہ صرف ایک جاہل عورت کی کہانی معلوم ہوگی۔ مگر وسیع تر اعتبار سے دیکھئے تو موجودہ زمانہ میں یہی ہر شخص کی کہانی ہے۔ موجودہ زمانہ حرص اور حب دنیا کا زمانہ ہے۔ آج ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی "سیٹ" پر قناعت نہیں کرتا۔ ہر آدمی دوسرے کی "سیٹ" پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ آدمی صرف وہاں رکتا ہے جہاں حالات نے اس کو رکنے کے لیے مجبور کر دیا ہو، اگر حالات اجازت دیں تو پہلی فرصت میں وہ دوسرے کی سیٹ پر قبضہ کرنے کا عمل شروع کر دے گا۔

خدا کی دنیا میں ہر چیز اپنی حد کے اندر عمل کرتی ہے۔ آسمانی اجسام اپنے اپنے مدار میں گھومتے ہیں۔ جنگل کے جانور اپنے فطری دائرہ میں رہ کر زندگی گزارتے ہیں۔ خدا کی دنیا میں صرف ایک ایسی مخلوق ہے جو حدبندی کو قبول نہیں کرتی۔ یہ انسان ہے۔ انسان بار بار اپنی حد سے تجاوز کرتا ہے۔ انسان اس چیز پر قابض ہونے کا منصوبہ بناتا ہے جو باعتبار حقیقت اس کی نہیں۔

بوڑھی میونی کا کیس بیوقوفی کا کیس تھا اور دوسرے لوگوں کا کیس سرکشی کا کیس۔ بیوقوفی قابل معافی ہوتی ہے، مگر سرکشی خدا کے قانون کے مطابق قابل معافی نہیں۔

غلط فہمی

محمد دوم یا محمد فاتح (۱۴۸۱-۱۴۳۲) ترکی کا مشہور مسلم حکمراں ہے۔ اس نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کو فتح کیا اور اس کو نئے نام (استانبول) کے ساتھ اپنی راجدھانی بنایا۔ محمد فاتح کے سیاسی کارناموں سے متاثر ہو کر بعض لوگ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ اس کو اس حدیث کا مصداق ٹھہرائیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ قسطنطنیہ کا ذکر فرمایا ہے اور اس میں شرکت کرنے والوں کو خصوصی بشارت دی ہے۔

ایک صاحب اپنے مضمون میں لکھتے ہیں: ترکی کے شہر قسطنطنیہ کے بارہ میں رحمۃ للعالمین پیش گوئی فرماتے ہیں کہ وہ سالار خوش قسمت ہوگا جو دیار قیصر کو بلاد اسلامیہ میں شامل کرے گا۔۔۔۔ صدیوں کے بعد یہ پیشین گوئی جس ترک کے ہاتھوں پوری ہوئی وہ محمد فاتح کے نام سے تاریخ کی زینت ہے۔ (صراط مستقیم، نومبر ۱۹۸۵)

حدیث کے اصل الفاظ کو دیکھے بغیر اگر اس مضمون کو پڑھا جائے تو بظاہر مذکورہ بات صحیح معلوم ہوگی۔ مگر حدیث کے اصل الفاظ کی روشنی میں دیکھئے تو یہ بات بالکل غلط ہو جاتی ہے۔ یہ حدیث بخاری میں ہے۔ اس کے متعلقہ حصہ کے الفاظ یہ ہیں: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم، اول جیش من امتی یغزون مدینۃ قیصر مغفور لھم (صحیح البخاری، کتاب الجہاد والسیر) یعنی میری امت کے پہلے لشکر کے لوگ جو کہ قیصر کے شہر (قسطنطنیہ) کا غزوہ کریں گے وہ سب بخشے ہوئے لوگ ہیں۔

اس حدیث میں قسطنطنیہ کی فتح کا ذکر نہیں ہے۔ صرف اس پر پہلا غزوہ کرنے کا ذکر ہے۔ مضمون نگار کے ذہن نے شعوری یا غیر شعوری طور پر پہلے غزوہ کو فتح کے ہم معنی بنایا اور پھر اس کو محمد فاتح پر چسپاں کر دیا۔ حالاں کہ حدیث کے الفاظ کی بنا پر شارحین حدیث عام طور پر اس کا مصداق یزید کی مہم کو قرار دیتے ہیں۔ ابن کثیر نے یزید بن معاویہ کو اس کا مصداق ٹھہراتے ہوئے یہ الفاظ لکھے ہیں: اور یزید پہلا شخص ہے جس نے قیصر کے شہر (قسطنطنیہ) پر حملہ کیا (وقد کان یزید اول من غزا مدینۃ قیصر، البدایہ والنہایہ)

ایک لفظ کے بدلنے سے کس طرح بات کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔

براگمان

یا ایھا الذین آمنوا اجتنبوا کثیراً من الظن ان بعض الظن اثم (الحجرات ۱۲) اے ایمان والو، بہت سے گمان سے بچو۔ بیشک بعض گمان گناہ ہیں۔

گمان (ظن) بڑی تقسیم میں دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک حسن ظن جو جائز ہے اور دوسرا سوءظن جو حرام ہے (ان الظن علی اقسام: منہا ما یجب اتباعہ وھو حسن الظن، ومنہا ما یحرم اتباعہ کسوء الظن، التفسیر المظہری) مفسر طبری نے اِنّ بَعضَ الظنِّ اثمٌ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومن کو اس سے منع فرمایا کہ وہ دوسرے مومن کے حق میں براگمان کرے (نھی اللہ عزوجل المومن ان یظن بالمومن شرا)

ایک ہے عین واقعہ یا عین مشاہدہ کی بنیاد پر رائے قائم کرنا۔ اور ایک ہے قیاس اور استنباط کی بنیاد پر رائے قائم کرنا۔ اس معاملہ میں شریعت کا اصول یہ ہے کہ اگر کسی کے بارے میں بری رائے قائم کرنے کا معاملہ ہو تو ایسی رائے صرف عین واقعہ یا عین مشاہدہ کی بنیاد پر قائم کی جاسکتی ہے۔ البتہ اگر اچھی رائے قائم کرنے کا معاملہ ہو تو دونوں طریقوں کی بنیاد پر رائے قائم کرنا جائز ہوگا۔ حدیث میں یہاں تک ارشاد ہوا ہے کہ اذا ظننتَ فلا تحقق۔ یعنی اگر کسی شخص کے بارہ میں تمہیں کوئی براگمان ہوجائے تو اس کی تحقیق میں نہ پڑو، بلکہ اس کو اپنے ذہن سے نکال دو۔

روایات میں آتا ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ولید بن عقبہ کا ذکر کیا ور کہا کہ اس شخص کی داڑھی سے شراب ٹپکتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: ہم کو تجسس سے روک دیا گیا ہے۔ البتہ اگر کوئی چیز بالکل ظاہر ہوجائے گی تو ہم اس پر مواخذہ کریں گے (قیل لہ ھذا فلان تقطر لحیتہ خمرا۔ فقال عبداللہ رضی اللہ عنہ قد نُھینا عن التجسس ولکن ان یظھر لنا شئی ناخذ بہ) حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا: ہمارے مومن بھائی کی زبان سے کوئی بات نکلے تو تم ہرگز اس کو برے معنی میں نہ لو جب تم اس کو اچھے معنی میں بھی لے سکتے ہو (لا تظنَّنَّ بکلمۃٍ خرجت من اخیک المومن الا خیرا وانت تجد لھا فی الخیر محملا، تفسیر ابن کثیر)

نیا انسان

إذا ابتليت عبدي المومن فصبر فلم يشكني الى عوّاده أطلقته من اساري ثم ابدلته لحما خيرا من لحمه ودما خيرا من دمه ثم يستأنف العمل

(رواه الحاكم عن ابی ھریرۃ)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب میں اپنے کسی مومن بندے کو کسی مصیبت میں مبتلا کروں اور وہ اس پر صبر کرے اور آنے جانے والوں سے اس کی شکایت نہ کرے تو میں اس کو اپنی قید سے آزاد کر دیتا ہوں۔ پھر میں اس کے گوشت کو دوسرے بہتر گوشت سے بدل دیتا ہوں اور اس کے خون کو دوسرے بہتر خون سے بدل دیتا ہوں۔ پھر وہ نئے نئے کام کرنے لگتا ہے۔

ایک آدمی وہ ہے جو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ دوسرا وہ ہے جو کوئی شخص خود اپنے آپ کو بناتا ہے۔ پہلا آدمی روایتی آدمی ہے۔ وہ خاندان اور ماحول کے زیر اثر کام کرتا ہے۔ مگر دوسرا آدمی ایک ارتقاء یافتہ آدمی ہے۔ وہ ایک ایسا آدمی ہے جس کے اندر عظیم انقلاب برپا ہو چکا ہے۔

یہ نیا آدمی کس طرح بنتا ہے۔ یہ نیا آدمی حالات کے درمیان بنتا ہے۔ موجودہ دنیا میں آدمی پر طرح طرح کے ناموافق حالات پیش آتے ہیں۔ ان ناموافق حالات میں آدمی جو ردعمل پیش کرتا ہے اسی سے یہ متعین ہوتا ہے کہ کوئی آدمی کیسا آدمی بنے گا۔ ایک ردعمل یہ ہے کہ ناموافق حالات آدمی کے اندر شکایت کی نفسیات پیدا کریں۔ وہ ان کے خلاف لوگوں سے شکایت اور احتجاج کرنے لگے۔ ایسے آدمی کی شخصیت کبھی ارتقا نہیں کر سکتی۔ وہ جہاں ہے وہیں پڑی رہے گی۔

دوسرا آدمی وہ ہے جو مصیبتوں پر صبر کرتا ہے۔ ناموافق حالات اس کے سکون کو برہم نہیں کرتے۔ دوسروں کے ظلم سے اس کے اندر نفرت کا جذبہ نہیں بھڑکتا۔ حالات کی شدت اس کے اندر جھنجھلاہٹ پیدا نہیں کرتی۔ ایسے آدمی کا حال یہ ہوگا کہ ناموافق حالات میں پڑنے کے بعد اس کے اندر نئی شخصیت ابھر آئے گی۔ اس کا صبر اس کو ایک ارتقا یافتہ انسان بنا دے گا۔

اعلیٰ کامیابی

۱۹۸۶ - ۸۷ کے سول سروس کے امتحانات میں ابتدائی جانچ (Preliminary test) میں پورے ملک سے تقریباً ۹۴ ہزار امیدوار شریک ہوئے۔ ان میں سے صرف دس ہزار امیدواروں کو تحریری امتحان (Main examination) میں حصہ لینے کا اہل قرار دیا گیا۔ اس مرحلہ کے بعد سترہ سو امیدواروں کو انٹرویو کے لیے چنا گیا۔ انٹرویو کے بعد جن امیدواروں کو آخری طور پر اعلیٰ ملکی ملازمتوں کا اہل قرار دیا گیا، ان کی تعداد ۸۵۵ تھی۔

ان امتحانات کے آخری نتیجہ کا اعلان ۸ جون ۱۹۸۷ کے اخبارات میں شائع ہوا۔ اس کے ساتھ کامیاب ہونے والوں کی فہرست بھی شامل تھی۔ اس وقت لوگوں نے دیکھا کہ اتنی لمبی فہرست اور اتنی طویل جانچ کے بعد سارے ملک سے جو لوگ سول سروسز کے اہل قرار دیئے گئے ہیں ان میں سب سے پہلا نام "عامر سبحانی" کا ہے۔ اس اعلیٰ ملکی امتحان میں عامر سبحانی نے ٹاپ کا درجہ حاصل کیا تھا۔ یہ تنہا واقعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کے لیے اعلیٰ ترین کامیابی کے مواقع کھلے ہوئے ہیں۔ کوئی تعصب یا کوئی جانبداری ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں۔

ہندستان کی کل آبادی میں مسلمان تقریباً ۱۲ فی صد ہیں۔ اس نسبت سے ۸۵۵ کی فہرست میں کم از کم ایک سو مسلمانوں کا نام ہونا چاہیے تھا۔ مگر عملاً صرف گیارہ مسلمان کامیاب ہونے والوں کی فہرست میں شامل ہو سکے ہیں۔ عام طور مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی وجہ تعصب ہے۔ مگر سول سروس کے امتحانات کے طریقہ پر غور کیجئے تو یہ بات بالکل بے بنیاد معلوم ہوگی۔

سول سروس کے تحریری امتحانات میں جواب کی کاپیوں پر امیدواروں کے نام لکھے ہوئے نہیں ہوتے۔ بلکہ صرف کوڈ نمبر درج ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں ممتحن کے لیے یہ اندازہ کرنا ممکن نہیں کہ امیدوار کا تعلق کس فرقہ سے ہے۔ اس کے بعد دوسرا مرحلہ انٹرویو کا ہے۔ انٹرویو بورڈ پانچ سے سات ممبران پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہر ممبر اپنے مضمون کا اکسپرٹ ہوتا ہے۔ اگر یہ ممبران متعصب اور تنگ نظر ہوں تو کوئی مسلمان نہ آئی اے ایس میں چنا جائے اور نہ ٹاپ کرسکے۔

الرسالہ دسمبر ۱۹۸۷

تاہم اگر بالفرض ان میں کسی درجہ میں تعصب کا وجود فرض کیا جائے تب بھی ان کا تعصب اس معاملہ میں فیصلہ کن نہیں بن سکتا۔

اس کی وجہ ان امتحانات کا نظام ہے۔ تحریری امتحانات پورے ۱۸۰۰ نمبر کے ہوتے ہیں۔ جب کہ انٹرویو میں صرف ۲۵۰ نمبر ہوتے ہیں۔ اب اگر بالفرض تعصب کی بنیاد پر انٹرویو میں کسی امیدوار کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے تو محض انٹرویو میں اچھا نمبر حاصل نہ کرنے کی وجہ سے اس کو نا اہل قرار نہیں دیا جاسکتا بشرطیکہ تحریری امتحان کے پرچوں میں اس نے اچھے نمبر حاصل کیے ہوں۔ کیوں کہ جب کامیاب امیدواروں کی آخری فہرست بنائی جاتی ہے تو تحریری امتحانات اور انٹرویو دونوں میں حاصل کردہ نمبروں کو یکجا کرکے شمار کیا جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ صرف انٹرویو میں حاصل کردہ نمبر کی بنیاد پر فیصلہ کردیا جائے۔

اس سلسلے میں ایک سبق آموز بات یہ ہے کہ عامر سبحانی صاحب نے تحریری امتحانات میں مجموعی طور پر ۶۴ فی صد نمبر حاصل کیے ہیں، جب کہ انٹرویو میں ان کو ۷۴ فی صد نمبر ملے ہیں۔ یعنی انٹرویو میں ۱۰ فی صد زیادہ۔

مسٹر سبحانی سے پوچھا گیا کہ انھوں نے سول سروس کے امتحان کے لیے کس طرح تیاری کی تھی۔ اس کے بارے میں بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ چھ مہینہ تک وہ روزانہ ۱۲ سے ۱۴ گھنٹہ تک مطالعہ میں صرف کرتے تھے۔ اس سے پہلے بھی انھیں آدھی رات تک پڑھنے کی عادت تھی۔ وہ نصابی کتابوں کے علاوہ انڈین اینڈ فارن ریویو، یوجنا اور انڈیا ٹوڈے کا برابر مطالعہ کرتے تھے۔ ان کے علاوہ وہ دہلی سے نکلنے والے کئی انگریزی اخبارات کو روزانہ پوری طرح پڑھتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسٹر عامر سبحانی کی غیر معمولی کامیابی کا راز غیر معمولی محنت ہے۔ وہ اپنی محنت کی وجہ سے میٹرک سے لے کر ایم اے تک ہمیشہ امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوتے رہے۔ ان سے پوچھا گیا کہ وہ اپنے تجربہ کی روشنی میں آئی اے ایس کے امتحان میں شریک ہونے والے نوجوانوں کو کیا مشورہ دیتے ہیں۔ انھوں نے کہا: سخت محنت اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی پوری جدوجہد۔

(۸ جون ۱۹۸۷ کے انگریزی اخبارات، نئی دنیا ۳۰ جون ۱۹۸۷، بلٹز ۱۵ اگست ۱۹۸۷)

ہندستان میں مسلمانوں کے لیے عمل کے دو میدان ہیں۔ ایک مطالبہ اور احتجاج کا میدان اور دوسرا محنت اور جدوجہد کا میدان۔ ہمارے لیڈر پہلے میدان میں سرگرمی کی علامت ہیں۔ اور عام سبحانی جیسے افراد دوسرے میدان میں سرگرمی کی علامت۔ ہمارے تمام لیڈر پچھلی نصف صدی سے ٹکراؤ کے راستے پر چل رہے ہیں۔ وہ فریق ثانی کو ذمہ دار ٹھہرا کر اس کے خلاف لامتناہی احتجاج کی مہم جاری کیے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف ہماری قوم میں عام سبحانی جیسے افراد بھی ہیں جنھوں نے فریق ثانی کی طرف سے نظریں ہٹا کر اپنی محنت پر بھروسہ کیا، وہ اپنے ذاتی امکانات کو بروئے کار لانے میں منہمک ہو گئے۔

اب عملی نتیجہ کے اعتبار سے دیکھیے تو لیڈر صاحبان کا طریقہ مسلم امت کے لیے سراسر بے نتیجہ ثابت ہو رہا ہے۔ اس راستہ سے ملت کو ایک فی صد بھی کوئی مثبت فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ اس کے برعکس جو لوگ عام سبحانی والے راستہ پر چلے وہ ہمیشہ کامیاب رہے۔ ان کی کوششوں سے ہمیشہ مثبت نتیجہ برآمد ہوا۔

یہ دو قسم کی مثالیں واضح طور پر بتا رہی ہیں کہ مسلمانوں کو اس ملک میں کیا کرنا چاہیے۔ انھیں لیڈروں کے بتائے ہوئے طریقہ کو مکمل طور پر چھوڑ دینا چاہیے اور "عام سبحانی" والے طریقہ کو مکمل طور پر اختیار کر لینا چاہیے۔ یہی واحد راستہ ہے جس پر چل کر مسلمان کامیابی کی منزل تک پہونچ سکتے ہیں۔

فرق کا سبب

راجہ مہندر پرتاپ (۱۹۷۹ - ۱۸۸۶) نے ۱۹۰۷ میں اپنی اہلیہ کے ساتھ دنیا کا سفر کیا تھا۔ اس سفر میں انھوں نے چار مہینے گزارے اور یورپ، امریکہ، کناڈا، جاپان وغیرہ جا کر نئی دنیا کو اپنی آنکھ سے دیکھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس طرح مجھے عالمی نگاہ حاصل ہوئی۔ میرے سفر نے مجھے مطمئن کر دیا کہ یورپ اور امریکہ کی ترقی کی وجہ جدید مشینوں اور صنعتوں کے سبب سے ہے۔ میں نے اپنا یہ ذہن بنایا کہ مجھے ہندستان میں ٹکنکل تعلیم کا آغاز کرنا ہے:

Thus I received World Vision. My tour convinced me that the progress of Europe and America was due to modern machines and industries. I made up my mind to start technical education.

چنانچہ سفر سے واپسی کے بعد راجہ مہندر پرتاپ نے ٹکنکل اسکول اور ٹکنکل کالج قائم کیا جس کا نام ابتداءً پریم مہاودیالیہ تھا۔ انھوں نے اپنی ریاست کے پانچ گاؤں اور ورندابن میں اپنا ایک بہت بڑا مکان اس کام کے لیے وقف کر دیا۔ ان پانچ گاؤں کی آمدنی تقریباً ۳۰ ہزار روپیہ سالانہ تھی۔ موجودہ صدی کے آغاز میں یہ آمدنی بہت بڑی رقم کے برابر تھی۔ ۱۹۱۱ میں راجہ مہندر پرتاپ نے دوبارہ مغربی دنیا کا سفر کیا اور انگلینڈ، جرمنی، سوئزرلینڈ اور پیرس کے ٹکنکل کالجوں کو دیکھا تاکہ اس کے مطابق اپنے یہاں کی ٹکنکل تعلیم کے اداروں کو مزید ترقی دے سکیں۔ (ڈے آفٹر، اگست ۱۹۸۷)

اکثریتی فرقہ میں راجہ مہندر پرتاپ جیسے بہت سے لوگ ہیں جنھوں نے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں مغربی دنیا کا سفر کیا۔ اور ہندستان واپس آکر اس قسم کا تعمیری کام کیا جس کی ایک مثال اوپر کے واقعہ میں نظر آتی ہے۔ جب کہ مسلمانوں میں ایسی کوئی بھی مثال موجود نہیں۔

ماضی کا یہی فرق ہے جو دونوں فرقوں کے حال کے فرق کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ یہ پچھڑے پن کا کیس ہے نہ کہ تعصب کا کیس۔

الرسالہ دسمبر ۱۹۸۷

کچھ اور تصویریں

۲۸ اگست ۱۹۸۷ کو فلپائن میں ناکام فوجی بغاوت ہوئی۔ اس کی اطلاع فوراً بذریعہ ٹیلی فون سی اول میں واقع ٹائم کے دفتر کو دی گئی۔ میگزین کی تین آدمیوں کی ٹیم ہوائی جہاز سے روانہ ہو کر فلپائن کی راجدھانی منیلا پہونچی۔ اس نے واقعہ کی ضروری تصویریں حاصل کیں اس کے بعد سی اول واپس آکر وہ لوگ اپنے تصویر بھیجنے والے مرکز (Photograph-transmission center) میں سرگرم ہو گئے۔ انھوں نے تصویروں کو کمپیوٹر نقطوں (Computer digits) میں تبدیل کر کے کمپیوٹر میں داخل کیا۔ پھر انھیں مصنوعی سیاروں کی مدد سے نیویارک کے صدر دفتر پہنچایا گیا۔ وہاں ان نقطوں کو دوبارہ رنگین تصویروں میں تبدیل کیا گیا۔ اس کے بعد یہ تصویریں مضامین کے ساتھ شامل کر کے پریس کے حوالہ کی گئیں۔ چند دن کے اندر فلپائن کے ناکام فوجی انقلاب کی باتصویر کہانی چھپ کر تمام دنیا کے قارئین کے سامنے موجود تھی۔ اس کو بتاتے ہوئے ٹائم (۷ ستمبر ۱۹۸۷) نے اپنی رپورٹ ان الفاظ پر ختم کی ہے کہ دنیا کی بہترین تصویر بھی بالکل بے کار ہے اگر وہ ابھی تک کسی شخص کے کیمرہ میں بند ہو:

The best photo in the world is no good
if it is still in somebody's camera (p. 3).

فطرت کے امکانات کی دریافت نے آج اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ واقعات کی تصویریں نہایت تیز رفتاری کے ساتھ حاصل کر کے شائع کی جاسکیں۔ تاہم آخری بہترین تصویر جو کوئی انسانی کیمرہ کھینچ سکتا ہے وہ بہرحال ایک ظاہری تصویر ہو گی۔ مگر اس دنیا میں کچھ اور تصویریں ہیں جو اس سے بھی زیادہ اہم ہیں۔ یہ تصویریں وہ ہیں جو اندرونی حقیقتوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک انسان کا سچائی کے لیے تڑپنا، ایک انسان کے سینہ میں خدا کی یاد کا بھونچال آنا، ایک انسان کا اپنی انا کو ہلاک کر کے حق کا اعتراف کرنا، یہ اس دنیا کی سب سے زیادہ اعلیٰ تصویریں ہیں۔ مگر وہ ابھی تک "کیمرہ" کے اندر بند ہیں۔ وہ لوگوں کے سامنے نہیں آئیں۔ جس دنیا میں کمتر تصویروں کے اظہار کے لیے اتنا کامل انتظام ہوا، کیا وہاں برتر تصویروں کے اظہار کے لیے کوئی انتظام نہ ہو گا۔

الرسالہ دسمبر ۱۹۸۷

ایک اور حملہ

۱۹۶۲ میں چین نے ہندستان کی مشرقی سرحد پر حملہ کیا تو ہندستانی فوج پہلے ہی مرحلہ میں شکست کھا گئی۔ ۱۹ نومبر ۱۹۶۲ کو اس وقت کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے پارلیمنٹ میں بیان دیا تو وہ لب ولہجہ کے اعتبار سے ایک مرثیہ سے کم نہ تھا۔ اگلی صبح کو لابی میں ایک پرانے کانگریسی لیڈر یہ کہتے ہوئے سنے گئے کہ "یہ بات کبھی میرے تصور میں نہیں آئی تھی کہ مہاتما گاندھی کے سیاسی وارث کے پاؤں مٹی کے ہوں گے"

۱۹ نومبر کو جواہر لال نہرو کی ایک تقریر ریڈیو سے نشر کی گئی۔ یہ تقریر یاس انگیز تھی، وہ حوصلہ بڑھانے والی نہ تھی۔ نہرو نے آسام والوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ جو کچھ آپ کے دروازہ پر ہو رہا ہے .... آسامیوں کے لیے یہ بات بڑی حیرت انگیز ثابت ہوئی۔ ان کا ریمارک یہ تھا کہ نہرو نے یہ کیوں کہا کہ "جو کچھ آپ کے دروازہ پر ہو رہا ہے" انھوں نے یہ کیوں نہیں کہا کہ "جو کچھ ہمارے دروازہ پر ہو رہا ہے"

شری ایچ وی کامتھ نے اس قسم کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا تھا:

"کوئی شخص یہ سوچ نہیں سکتا تھا کہ وہ آدمی جو عالم گیر شہرت کے آسمان پر اڑانیں لگاتا رہا ہے، وہ جنگ کے زمانہ میں اتنی نیچی سطح پر آجائے گا۔ اور اس کی پالیسیوں کا ڈھانچہ اس طرح زمیں بوس ہو جائے گا۔ جواہر لال نہرو نے بعد کو خود تسلیم کیا کہ میں سپنوں کی دنیا میں رہ رہا تھا اور حقائق سے بالکل بے نیاز ہو گیا تھا"

(الجمعیۃ ویکلی ۱۳ جولائی ۱۹۷۳)

۱۹۶۲ کے چینی حملہ سے زیادہ بڑا ایک حملہ ہے جس کا خطرہ ہر آدمی کو درپیش ہے۔ یہ موت کا حملہ ہے۔ موت انسان کے اوپر اسی قسم کا شدید تر حملہ ہے۔ انسان اپنی دنیاوی کامیابیوں میں کھو کر حقیقت سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ مرنے کے بعد جب اچانک اس کو اصل حقیقت کا سامنا پیش آئے گا تو اس وقت اس کی بدحواسی کا کیا عالم ہوگا۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو کہاں چھپائے گا۔

الرسالہ دسمبر ۱۹۸۷

فطرت کی پکار

ماسکو سے ایک انگریزی ماہنامہ نکلتا ہے، اس کا نام اسپٹنک (Sputnik) ہے۔ اس کے شمارہ اگست ۱۹۸۷ میں ایک مضمون چھپا ہے جس کا عنوان ہے :

Truth, Progress and the Human Soul

اس کے مضمون نگار روس کے مشہور سائنس داں یاکوف زلڈووچ (Yakov Zeldovich) ہیں۔ وہ ۱۹۱۴ میں پیدا ہوئے اور اب روس کی اکیڈمی آف سائنسز کے ممبر ہیں۔

مسٹر زلڈووچ نے اپنے بارے میں اقرار کیا ہے کہ وہ ایک ملحد ہیں۔ وہ خدا اور مذہب کو نہیں مانتے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ کہتے ہیں کہ انسانی معاشروں میں مذہب کی موجودگی ایک ثابت شدہ تاریخی حقیقت ہے۔ نیز یہ کہ روحانی تقاضے انسان کے شعور میں گہرائی کے ساتھ پیوست ہیں :

Spiritual needs are deeply embedded
in human consciousness.

انسانی فطرت کی یہ نوعیت اتنی واضح اور اتنی قطعی ہے کہ تمام سنجیدہ لوگوں نے اس کا اقرار کیا ہے۔ قدیم ترین زمانہ سے لے کر آج تک تمام انسان اس احساس کو لے کر پیدا ہوتے رہے ہیں۔ ملحد معاشروں میں پیدا ہونے والے بچے بھی اپنے آپ کو اس احساس سے خالی نہ کر سکے۔ انسانی فطرت کا یہ تقاضا ایک ایسی مانی ہوئی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس حقیقت کو مان لینے کے بعد صرف یہ سوال باقی رہتا ہے کہ اس تقاضے کا جواب کیا ہے۔ مذکورہ سائنس داں کا کہنا ہے کہ اس کا جواب نیچرل سائنس ہے۔ مگر یہ جواب اپنی تردید آپ ہے۔ اس لیے کہ نیچرل سائنس ایک مادی چیز ہے اور انسانی فطرت کا تقاضا ایک روحانی چیز۔ پھر ایک مادی چیز ایک روحانی سوال کا جواب کس طرح بن سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس سوال کا جواب صرف خداوند تعالیٰ ہے۔ مخلوق اپنے خالق کی تلاش میں ہے، اور خالق کو پانے کے بعد ہی مخلوق کو سکون حاصل ہو سکتا ہے۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔

غلطی کے باوجود

۲ اگست ۱۹۸۷ کو جوہانسبرگ (افریقہ) میں سوال وجواب کا ایک مقابلہ ہوا۔ اس مقابلہ کا نام تھا:

Operation Hunger Goldrush quiz show

اس مقابلہ میں صحیح جواب دینے والے کو ایک ملین رینڈ (Rand) ملنے والا تھا جو کہ تقریباً ۶۰ لاکھ ہندستانی روپیہ کے برابر ہے۔ یہ انعام جان اسمڈل (John Smeddle) کو ملا، اگرچہ اس نے صحیح جواب نہیں دیا تھا۔

اس مقابلہ میں ۲۰ آدمی حصہ لے رہے تھے۔ سوال وجواب کا پورا منظر ٹیلی ویژن پر دکھایا جارہا تھا۔ جب تمام لوگ اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے تو جج نے آخری سوال پیش کیا: "ہنری ہشتم (Henry VIII) کی چھ بیویوں میں سے تین بیویوں کے نام بتائیے"۔ مسٹر اسمڈل نے حسب ذیل تین نام بتائے:

Ann Boleyn
Catherine of Aragon
Jane Grey

جج جانی فرینکل (Jonny Frankel) نے مسٹر اسمڈل کے جواب کو صحیح قرار دے کر اس کے حق میں مذکورہ انعام کا فیصلہ کر دیا۔ مگر یہ جج کی غلطی تھی۔ اس کا بتایا ہوا تیسرا نام جین گرے (Jane Grey) دراصل ہنری ہشتم کی چھوٹی بہن کی پوتی کا نام تھا جس کا کبھی مذکورہ انگلستانی بادشاہ سے نکاح نہیں ہوا۔ ہنری ہشتم کی بیوی کا صحیح نام جین سیمور (Jane Seymour) تھا۔ مگر دونوں ناموں کے پہلے جزء کی یکسانیت کی وجہ سے غالباً جج کو تشابہ ہو گیا۔ اور اس نے جواب کو صحیح قرار دے کر انعام اس کے حوالے کر دیا (ٹیلی گراف، کلکتہ، ۳ اگست ۱۹۸۷، صفحہ ۳)

موجودہ دنیا میں یہ ممکن ہے کہ ایک شخص غلط جواب دے کر بھی اول انعام پالے۔ مگر آخرت میں ایسا ہونا ممکن نہ ہوگا۔ آخرت کی دنیا میں صرف اس شخص کو اول انعام ملے گا جس نے واقعۃً صحیح جواب دیا ہو۔ غلط جواب دینے والے کے لیے آخرت کی دنیا میں کچھ نہیں۔

ایک جائزہ

لارڈ بنٹنک (Lord Bentick) نے ۱۸۲۹ میں ستی (خود سوزی) کو خلاف قانون قرار دیا تھا۔ مگر ۴ ستمبر ۱۹۸۷ کو دیورالا (سیکر، راجستھان) میں ۱۸ سالہ بیوہ روپ کنور کی ستی نے بتایا کہ یہ رسم ابھی ہندستان سے ختم نہیں ہوئی۔ اس واقعہ نے ملک کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیا ہے اور سنجیدہ لوگوں نے اس کی سخت مذمت کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس غیر انسانی رسم کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔

تاہم ایک بات بہت عجیب ہے۔ کچھ لوگوں نے ستی کی رسم کی مذمت کرتے ہوئے غیر ضروری طور پر اس کے ساتھ اسلام کو بھی بریکٹ کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں مسٹر آئی کے گجرال (سابق وزیر اطلاعات ونشریات) کا ایک آرٹیکل ہمارے پیش نظر ہے۔ یہ آرٹیکل اخبار ٹیلی گراف (۲۰ اکتوبر ۱۹۸۷) میں چھپا ہے اور اس کا عنوان یہ ہے:

Widow-burning a national disgrace

مسٹر گجرال نے ستی پر اظہار خیال کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے کہ بیوہ کو جلانے کا بے ہودہ عمل جس کو پر لطف طور پر ستی کہا جاتا ہے، راجستھان کے ایک دور دراز گاؤں میں پیش آیا۔ اس واقعہ نے ظاہر کیا ہے کہ قرون وسطی کی وحشیانہ رسم ہمارے ملک میں آج بھی زندہ ہے۔ مسٹر گجرال نے ستی کے احیاء کی شدید مذمت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کو ہمیں جرأت مندانہ طور پر ختم کر دینا چاہیے، قبل اس کے کہ فنڈمنٹلزم کوئی متشددانہ رخ اختیار کرلے۔

یہاں تک مسٹر گجرال بالکل صحیح راستہ پر نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد ان کا قلم غلط پڑی پر چلا جاتا ہے جب کہ وہ غیر ضروری طور پر "ہندو فنڈمنٹلزم" کے ساتھ "مسلم فنڈمنٹلزم" کو بریکٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ذاتی طور پر مجھے فنڈمنٹلزم کی اصطلاح پسند نہیں۔ میرے نزدیک یہ ایک متعصبانہ اصطلاح ہے نہ کہ حقیقۃً علمی اصطلاح۔ تاہم اس لفظی بحث کو نظر انداز کرتے ہوئے میں اصل مسئلہ کے بارے میں کچھ باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

مسٹر گجرال کے آرٹیکل کے جس پیراگراف پر اس وقت مجھے اظہار خیال کرنا ہے، اس

کے الفاظ یہ ہیں :

The Muslim fundamentalists had succeeded in browbeating the leadership to get a law enacted that gave them the traditional rights "to maltreat female divorcees of their community".

مسلم بنیاد پرست اس میں کامیاب ہوگیے کہ وہ ہمارے لیڈروں کو دھمکا کر ایک قانون بنوا لیں جس کے تحت انھیں یہ روایتی حق مل جائے کہ وہ اپنے فرقہ کی مطلقہ عورتوں کے ساتھ بدسلوکی کر سکیں۔

مسٹر گجرال نے یہاں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اسلام میں بھی "ستی" جیسی غیر معقول تعلیمات موجود ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ خود انتہائی غیر معقول بات ہے کہ اسلام کے بارے میں اس قسم کا بے ثبوت ریمارک دیا جائے۔

مسٹر گجرال نے جس قانون کا حوالہ دیا ہے، اس سے ان کی مراد مطلقہ مسلم خواتین سے متعلق قانون The Muslim Women (Protection of Rights on Divorce) Bill 1986 ہے۔ مگر اس قانون کی کسی بھی دفعہ میں وہ بات نہیں جس کو فاضل مضمون نگار نے واوین کے ساتھ درج کرنا پسند کیا ہے۔ یعنی مسلم مطلقہ خواتین کے ساتھ بدسلوکی۔

مذکورہ قانون کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ایک مسلم عورت کو طلاق ہو جائے تو عدت گزارنے کے بعد سے دوسرا نکاح ہونے تک اس کے ماہانہ خرچ کی ذمہ داری، عام حالات میں اس کے سابق شوہر پر نہ ہوگی۔ بلکہ مطلقہ عورت کی وراثتی جائداد سے یا اس کے رشتہ داروں کے ذریعہ اس کے گزارہ کا انتظام کیا جائے گا۔ اور اگر بالفرض کسی واقعہ میں ایسا انتظام نہ ہوسکے تو متعلقہ ریاست کا وقف بورڈ اس کو ادا کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔ اور مجسٹریٹ بذریعہ قانون اس کا نفاذ عمل میں لائے گا۔

اس انتظام کو بدسلوکی (Maltreatment) کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ یہ تو ایک زیادہ بہتر اور زیادہ معقول بندوبست ہے، نہ کہ کسی قسم کی بدسلوکی۔ کیونکہ سابق شوہر بے روزگار یا کم آمدنی والا ہو سکتا ہے، یا وہ طلاق کے بعد وفات پا سکتا ہے۔ جب کہ دوسری صورت میں یہ ضمانت ہے کہ عورت کے اخراجات کی بقدر ضرورت فراہمی آخر مدت تک جاری رہے گی۔

روپ کنور کی ستی کے بعد اس موضوع پر مختلف لوگوں نے تحقیقات کی ہیں۔ بمبئی یونین آف جرنلسٹس (BUJ) نے اس سلسلے میں ایک اسٹڈی ٹیم مقرر کی۔ یہ ٹیم تین تعلیم یافتہ ہندو خواتین پر مشتمل تھی۔ وہ اکتوبر ۱۹۸۷ میں دیورالا گئی اور تمام حالات کی تحقیق کرکے اپنی رپورٹ مرتب کی۔ اس کے بعد یو این آئی نے اس رپورٹ کو نشر کیا۔ ہندستان ٹائمس (۲۱ اکتوبر ۱۹۸۷) نے اس رپورٹ کو اپنے صفحۂ اول پر شائع کیا ہے۔ اس کے مطابق رپورٹ کا ایک حصہ یہ ہے :

The study team found that the root cause of the sati tradition, which had claimed 38 lives since independence lay in the status of women in the Rajput society. General secretary of Mahila Congress Sudha Raina told the team that for a Rajput widow, life is as good as over. Widows are expected to sleep on the floor, abstain from eating meat, avoid using certain colours, stay away from all functions and tolerate advances from all male members of the family.

The Hindustan Times, October 21, 1987

اسٹڈی ٹیم نے پایا کہ ستی کی روایت جو آزادی کے بعد سے ۳۸ جانیں لے چکی ہے، اس کا اصل سبب راجپوت سماج میں عورتوں کی حیثیت ہے۔ مہیلا کانگریس کی جنرل سکریٹری سودھا رائنا نے ٹیم کو بتایا کہ ایک راجپوت بیوہ کے لیے زندگی گویا ختم ہو جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ بیوہ سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ زمین پر سوئے، وہ گوشت نہ کھائے۔ کچھ رنگوں کا استعمال نہ کرے۔ ہر قسم کی تقریبات سے دور رہے۔ خاندان کے ہر مرد کے اقدامات کو برداشت کرے۔

یہ ایک ہلکا سا نقشہ اس صورت حال کا ہے جو ہندو سماج میں بیوہ عورت کے ساتھ پیش آتا ہے۔ ہندو روایات کے مطابق، بیوہ عورت کی دوسری شادی نہیں ہو سکتی۔ مزید یہ کہ وہ شادی کے بغیر رہ کر بھی ہندو سماج میں با عزت زندگی کی امید نہیں رکھتی۔ ایسی حالت میں ہندو سماج میں بیوہ ہونے کے بعد ستی ہونے کا رواج شاید اس لیے بھی پڑا کہ عورت نے اس کو نسبتاً آسان سمجھا کہ وہ تا حیات "جلنے" کی مصیبت اٹھانے کے بجائے ایک ہی دن میں جل کر ختم ہو جائے۔ مگر اسلامی روایات کے مطابق اس قسم کا کوئی بھی مسئلہ مسلم بیوہ یا مسلم مطلقہ کے لیے نہیں۔ ایسی حالت میں مسلم مطلقہ کے معاملہ کا تقابل ہندو بیوہ کی ستی سے کس طرح کیا جا سکتا ہے۔

مسلمان بیوہ یا مطلقہ کے لیے دوسرے نکاح کا راستہ پوری طرح کھلا ہوا ہے۔ وہ اسلامی

قانون وراثت کے تحت خاندان کی جائداد میں حصہ دار ہے۔ وہ بیوگی یا طلاق کے بعد بھی پوری طرح باعزت زندگی گزار سکتی ہے۔ اسلامی اصول بیوہ اور غیر بیوہ یا مطلقہ اور غیر مطلقہ کے درمیان درجہ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں کرتا۔

ایسی حالت میں مسلم مطلقہ کے لیے سابقہ شوہر سے گزارہ لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ گزارہ لینے کا جو مقصد ہے وہ سابقہ شوہر سے گزارہ لیے بغیر اسے پوری طرح حاصل ہے۔ شاہ بانو بیگم کے مشہور کیس (A.I.R. 1985-S.C. 945) میں یہ بات ثابت شدہ ہے کہ اس کے لیے گزارہ کا دعویٰ برائے ضرورت نہ تھا، بلکہ برائے انتقام تھا۔ ورنہ شاہ بانو کی ضرورت اس کے میکہ میں اس کے بغیر ہی بخوبی طور پر پوری ہو رہی تھی۔ (مسلم عورت کے بارے میں اسلام کے قانون کی تفصیل کے لیے دیکھئے: خاتونِ اسلام)

مسٹر گجرال نے اپنے مضمون میں نہایت نامناسب طور پر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اسلام میں بھی "ستی" جیسی ناشائستہ تعلیمات موجود ہیں۔ اس کا ثبوت ان کے نزدیک "مسلم فنڈمنٹلزم" کا یہ عمل ہے کہ اس نے مسلم مطلقہ عورت کو اس کے سابقہ شوہر سے گزارہ نہ دلانے کا قانون بنوایا۔ مگر ان کا یہ حوالہ ان کی سنجیدگی کو مشتبہ کرتا ہے۔ کیونکہ انھوں نے مذکورہ قانون کو اس کی اصل صورت میں بیان نہیں کیا۔ اور اس کی وجہ بظاہر یہی ہے کہ قانون کو اس کی اصل صورت میں بیان کرنا ان کے مفید مطلب نہیں تھا۔ وہ ہندو فنڈمنٹلزم اور مسلم فنڈمنٹلزم دونوں کو برابر کی چیز ثابت کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ واضح ہے کہ "بیوہ کو آگ میں جلانا" اور "مطلقہ کو اس کے سابقہ شوہر سے گزارہ نہ دلانا" دونوں برابر کے واقعات نہیں ہیں۔ اس لیے مضمون نگار کو گزارہ (Maintenance) کی جگہ بدسلوکی (Maltreatment) کا لفظ لکھنا پڑا۔ تاکہ ہندو فنڈمنٹلزم اور مسلم فنڈمنٹلزم دونوں برابر کی چیز دکھائی دینے لگیں۔

اس طرح مضمون نگار نے خود ہی اسلام کی صداقت کا بالواسطہ اعتراف کر لیا۔ کسی نظریہ کی صداقت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کو اس وقت تک نشانۂ تنقید بنانا ممکن نہ ہو جب تک اس کو بگاڑ کر خود ساختہ شکل میں پیش نہ کیا جائے۔

دو طریقے

قرآن میں قیامت کے احوال کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے :

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُم فِي النَّارِ يَقُولُونَ يٰلَيْتَنَا أَطَعْنَا اللهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَا ـ وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا ـ رَبَّنَا آتِهِم ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا

(الاحزاب ۶۸ - ۶۶)

جس دن ان کے چہرے آگ میں اُلٹے پلٹے جائیں گے۔ وہ کہیں گے، اے کاش ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے رسول کی اطاعت کی ہوتی۔ اور وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب، ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی بات مانی تو انھوں نے ہم کو راہ سے بھٹکا دیا۔ اے ہمارے رب، ان کو دگنا عذاب دے اور ان پر بھاری لعنت کر۔

قرآن کی ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں انسانوں کی دو قسمیں ہیں۔ اور اسی کے مطابق آخرت کے انجام کے اعتبار سے ان کی دو قسمیں ہو جاتی ہیں۔ ایک وہ گروہ جو خدا کی کتاب اور رسول کی سنت میں غور کرے اور اس میں جو رہنمائی ملے اس کو کسی تبدیلی کے بغیر اختیار کرلے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے لوگ وہ ہیں جن کے معاملات کا رُخ ان کے دنیوی لیڈروں اور ان کے مذہبی پیشواؤں کی رایوں سے متعین ہوتا ہے۔ اوّل الذکر لوگ ہی اللہ کی رحمت کے مستحق ہیں۔ دوسرے لوگ بھٹکے ہوئے لوگ ہیں۔ وہ خدا کی رحمت کے مستحق نہیں قرار پا سکتے۔ خواہ وہ اپنے بڑوں کی پیروی کو خود ساختہ طور پر قرآن و حدیث کے الفاظ میں کیوں نہ بیان کرتے ہوں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا کیس بد قسمتی سے دوسری نوعیت کے گروہ کا کیس ہے۔ آج مسلمانوں کی بھیڑ جن راستوں کی طرف چلی جا رہی ہے وہ خدا اور رسول کا راستہ نہیں بلکہ ان کے نعرہ باز لیڈروں کا راستہ ہے۔ آپ ان لوگوں کو قرآن کی آیتیں سنا کر بتائیے کہ تمہارا راستہ قرآن کا راستہ نہیں۔ یہ خدا کے رسول کی سنّت کے مطابق نہیں تو وہ ہرگز آپ کی باتوں پر دھیان نہیں دیں گے۔ وہ کہیں گے کہ ہمیں تو وہی کرنا ہے جو ہمارے بڑوں نے ہم کو بتایا ہے، ہم تمہاری دلیلوں سے اپنا راستہ بدلنے والے نہیں۔

سرّ شقائنا فینا

قرآن وحدیث میں نہایت واضح طور پر یہ بات بتائی گئی ہے کہ مسلمانوں پر جب بھی کوئی مصیبت آئے گی تو ان کی اپنی داخلی کمزوریوں کی بنا پر آئے گی۔ باہر کی کوئی طاقت انھیں کبھی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ میں علماء اسلام نے یہ کیا کہ جب بھی مسلمانوں پر کوئی مصیبت آئی تو انھوں نے خود مسلمانوں کو یہ نصیحت کی کہ تم اپنی اندرونی خرابیوں کی اصلاح کرو، کیوں کہ اپنی اندرونی خرابیوں کی اصلاح کرکے ہی تم بیرونی خطرات سے بچ سکتے ہو۔

۱۷۳۹ میں ایرانی حکمراں نادر شاہ نے ہندستان پر حملہ کیا اور دہلی کے مسلمانوں کو لوٹا اور ان کا قتل عام کیا۔ یہ بے حد سخت لمحہ تھا۔ لوگوں نے وقت کے بزرگ حضرت مرزا مظہر جانجاناں سے اس کی شکایت کی۔ انھوں نے ایسا نہیں کیا کہ نادر شاہ پر ذمہ داری ڈال کر اس کو لعنت ملامت کرنے لگیں۔ اس کے بجائے انھوں نے یہ فرمایا کہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ ہماری اپنی ہی بداعمالیوں کی وجہ سے ہو رہا ہے، اس لیے سب سے زیادہ اپنے اعمال کی اصلاح کی طرف توجہ کرو۔ یہ دراصل خود ہمارے برے اعمال ہیں جنھوں نے نادر کی صورت اختیار کر لی ہے:

شامت اعمال ما صورتِ نادر گرفت

ماہنامہ الفرقان (جولائی ۱۹۸۷) میں مولانا محمد منظور نعمانی کی ایک تقریر شائع ہوئی ہے۔ بارہ صفحات کی یہ تقریر خاص اسی موضوع پر ہے۔ اس میں مولانا موصوف فرماتے ہیں:

"قرآن وحدیث کی روشنی میں یقین ہے کہ آج ہم مسلمانوں پر جو مصیبتیں جہاں بھی آرہی ہیں اور جو مظالم ہو رہے ہیں وہ سب ہماری بداعمالیوں اور نافرمانیوں کے نتائج ہیں۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے: وماظلمناھم ولکن کانوا انفسھم یظلمون۔ ایک حدیث قدسی کے الفاظ ہیں: انما ھی اعمالکم احصیھا لکم۔ بدقسمتی سے اس وقت صورت حال یہ ہے کہ جن مشکلات میں مسلمان مبتلا ہیں ان سے نجات پانے کے لیے ان کے ناخدا شناس اور دین سے بے بہرہ قائد و رہنما ان قوموں کے طور طریقوں سے رہنمائی حاصل کرنا چاہتے ہیں جو ایمان سے محروم ہیں۔ قرآن سے ہدایت اور رہنمائی حاصل کرنے

کرنے کا ان کو خیال بھی نہیں آتا، خدا کے لیے اس طریقہ کو بدلیے ورنہ حالات بد سے بدتر ہوتے رہیں گے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ ہم پر ظلم نہیں ہو رہا ہے۔ ظلم ہو رہا ہے۔ میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ یہ ظلم اس ظلم کے نتیجہ میں ہو رہا ہے جو ہم اپنے اوپر کر رہے ہیں۔ اگر ہم کسی اعتبار سے ظالم نہ ہوتے، صرف مظلوم ہی ہوتے تو اللہ کی مدد آچکی ہوتی اور ہم پر ظلم کرنے والوں پر اللہ کی پکڑ آگئی ہوتی۔ ایک اور ظلم ہم اپنے اوپر یہ کر رہے ہیں کہ ہم جہاں رہتے ہیں وہاں کے لوگوں کو اپنا حریف اور دشمن سمجھ کر رہتے ہیں، بجائے اس کے کہ ہم ان کو اللہ کا بندہ سمجھتے اور محبت و حکمت اور اخلاق کے ساتھ ان کو اللہ کی رحمت سے اور ہدایت سے اور جنت سے قریب کرنے کی کوشش کرتے" (صفحہ ۱۹-۲۱)

ندوۃ العلماء (لکھنؤ) سے ایک عربی پرچہ نکلتا ہے جس کا نام الرائد ہے۔ اس پرچہ کے شمارہ ۱-۱۶ ستمبر ۱۹۸۷ میں ایک مضمون چھپا ہے جس کا عنوان ہے: سرّ شقائنا فینا (ہماری بدبختی کا راز ہمارے اندر ہے) اس مضمون میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کی تمام مصیبتوں کی جڑ ان کی اپنی اخلاقی گراوٹ ہے۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے:

ان المسلمین فقدوا سیرتهم المثالیة ...... فلو تصدى ای شخص للعثور على الرذائل الخلقیة کلها مجتمعة فی امة لوجد افراد هذه الامة خیر مثال لها على اختلاف الاجناس والالوان (صفحہ ۳)

اس عربی عبارت کا اردو ترجمہ خود ندوہ ہی کے دوسرے جریدہ تعمیر حیات (۲۵ اکتوبر ۱۹۸۷، صفحہ ۷) میں ان الفاظ میں چھپا ہے:

"اگر کوئی شخص تمام اخلاقی برائیوں کو یکجا طور پر دیکھنا چاہے تو اس کو سب سے واضح اور نمایاں مثال مسلمانوں ہی کی زندگی میں ملے گی۔ رنگ، نسل، زبان اور علاقہ کے لحاظ سے ان میں خواہ کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو، لیکن برائیوں کے قبول کرنے میں غیر معمولی اتفاق نظر آتا ہے"

اسی بات کو مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے ان لفظوں میں بیان فرمایا: "مسلمانوں کی دنیوی مصائب و آفات اور عزت و دولت اور حکومت وغیرہ سے محرومی بھی ان کے برے اعمال کے نتائج اور تعلیمات قرآن و حدیث سے غفلت اور اعراض کے ثمرات ہیں" (تعمیر حیات ۲۵ اکتوبر ۸۷)

جدید امکانات

سائنسی دریافتیں اکثر اتفاقی حادثہ کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں۔ سائنس کی تاریخ بتاتی ہے کہ بعض اوقات اچانک ایک دھماکہ پیش آتا ہے۔ یہ دھماکہ بظاہر ایک ناخوش گوار حادثہ ہوتا ہے۔ مگر اس ناخوش گوار حادثہ میں ایک خوش گوار پہلو نکل آتا ہے۔ کیوں کہ وہ قدرت کے ایک امکان کو بتاتا ہے۔ اس دھماکہ کے ذریعہ سائنس داں فطرت میں چھپی ہوئی ایک طاقت کو دریافت کرتا ہے اور اس کو استعمال کرکے انسانی تمدن کو آگے لے جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ انفجاری مادہ (Explosive) کی ابتدائی دریافت اسی طرح ایک حادثہ کے ذریعہ ہوئی۔ اس اتفاقی حادثہ میں اگرچہ کچھ جانی نقصان ہوا۔ مگر اسی حادثہ کے ذریعہ انسان نے اس عظیم طاقت کو دریافت کیا جس نے سائنس کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔

قرآن پر پابندی لگانے کی ناکام کوشش

ایسا ہی ایک واقعہ مئی ۱۹۸۵ میں ہندستان میں ہوا۔ سائنسی اعتبار سے نہیں بلکہ مذہبی اعتبار سے۔ یہ واقعہ کلکتہ ہائی کورٹ کا وہ مقدمہ تھا جس کے ذریعے قرآن کی اشاعت کو اس ملک میں قانونی طور پر بند کرنے کی ناکام کوشش کی گئی۔ بظاہر یہ ایک ناپسندیدہ واقعہ تھا۔ مگر اس ناپسندیدہ واقعہ سے ایک عظیم الشان بھلائی نکل آئی۔ اس نے واقعاتی طور پر بتایا کہ موجودہ زمانہ میں کس طرح اسلامی دعوت کے نئے امکانات کھل گئے ہیں۔ یہ واقعہ گویا اس تاریخی حقیقت کا عملی اعلان تھا کہ دنیا اب مذہبی پابندی کے دور سے گزر کر مذہبی آزادی کے دور میں داخل ہو گئی ہے۔

یہ ایک بے حد اہم واقعہ ہے۔ اس کی غیر معمولی اہمیت اس وقت سمجھ میں آتی ہے جب کہ جدید ہندستان کے اس واقعہ کو قدیم عرب کے اسی قسم کے واقعہ سے ملا کر دیکھا جائے اور دونوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے۔

قدیم مکّہ اور جدید ہندستان

آپ جانتے ہیں کہ قدیم مکہ میں مشرکین کا غلبہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کے سامنے قرآن پیش کیا تو وہ اس کے سخت مخالف ہو گئے۔ انہوں نے چاہا کہ آپ قرآن کی تبلیغ چھوڑ دیں۔ سیرت ابن ہشام میں اس زمانہ کا ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اسلام قبول کیا۔ ان کو شوق ہوا کہ وہ قرآن کا پیغام لوگوں تک پہونچائیں۔ وہ کعبہ گئے اور وہاں مقام ابراہیم پر کھڑے ہو کر سورہ رحمٰن بلند آواز سے پڑھنے لگے۔ یہ سن کر مکہ کے مشرکین دوڑے۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ پڑھنے والا قرآن کی آیتیں پڑھ رہا ہے تو وہ سخت غصہ ہو گئے۔ انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے چہرے پر مارنا شروع کر دیا (فجعلوا یضربون فی وجهه جزء اوّل صفحہ ۳۳۷) حضرت عبداللہ بن مسعود اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور اس پر مار کے نشانات دکھائی دے رہے تھے۔

اس طرح کے واقعات قدیم مکہ میں روزانہ پیش آتے تھے۔ قرآن کی تعلیمات ان کے مزاج کے سراسر خلاف تھیں۔ اس لیے وہ اس کے سخت دشمن بن گئے۔ یہاں تک کہ انہوں نے آپ کو مجبور کیا کہ آپ مکہ چھوڑ دیں اور مکہ سے باہر چلے جائیں۔

قدیم مکہ میں پیغمبر اسلام کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کو اگر آج کل کی زبان میں کہا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ "مکّہ کے مشرک سرداروں نے قرآن کی اشاعت پر پابندی لگا دی" قدیم مکہ میں اگر کوئی اخبار ہوتا تو وہ اس واقعہ کی سرخی انہیں الفاظ میں قائم کرتا۔ پابندی لگانے کی یہ اسکیم پوری طرح عمل میں آئی۔ وہ اس حد تک موثر ثابت ہوئی کہ پیغمبر اسلام کو قرآن سمیت مکہ چھوڑ دینا پڑا۔ اس کے بعد آپ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مدینہ چلے گئے۔ مکہ کو قرآن سے خالی کر دیا گیا۔

اب دوسری مثال لیجئے۔ اس واقعہ کے چودہ سو سال بعد ۱۹۸۵ میں ہندستان میں اسی نوعیت کا مگر اس سے بالکل مختلف واقعہ پیش آتا ہے۔ حیدر آباد کے ایک شخص چاند مل چوپڑا

نے کلکتہ ہائی کورٹ میں قرآن کے خلاف ایک رٹ پٹیشن داخل کیا۔ اس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ قرآن تشدد کی تعلیم دیتا ہے، اس لیے اس کی اشاعت اور تقسیم کو قانونی طور پر ممنوع قرار دے دیا جائے۔

کلکتہ ہائی کورٹ کی خاتون جج پدما خستگیر نے ۱۸ اپریل ۱۹۸۵ کو یہ پٹیشن سماعت کے لیے منظور کر لیا۔ مگر اس کے فوراً بعد اس کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں۔ حتیٰ کہ مغربی بنگال کی ریاستی حکومت اور ملک کی مرکزی حکومت، دونوں نے قرآن پر پابندی لگانے کی کوشش کے خلاف سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔ مرکزی وزیر قانون مسٹر اشوک سین فوراً سفر کر کے دہلی سے کلکتہ پہونچے۔ اٹارنی جنرل مسٹر پارس رام اور مغربی بنگال کے ایڈوکیٹ جنرل مسٹر ایس کے اچاریہ نے اس کے خلاف عدالت میں زبردست وکالت کی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جسٹس پدما خستگیر نے خاموشی سے اس کیس کو اپنے زیر سماعت مقدمات کی فہرست سے خارج کر دیا۔ اس کے بعد کلکتہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کی ہدایت کے تحت مسٹر جسٹس بی سی باسک (B.C. Basak) نے اس مقدمہ کی سماعت کی۔ انہوں نے ۱۳ مئی کو پہلی ہی بیٹھک میں اپنا ابتدائی فیصلہ دے دیا۔ اس کے بعد ۱۷ مئی کو آخری فیصلہ دیتے ہوئے پٹیشن کو قطعی خارج کر دیا۔ فاضل جج نے اپنے فیصلے میں لکھا:

Courts cannot sit in judgment on holy books like the Koran

عدالتوں کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ قرآن جیسی مقدس کتابوں کے بارے میں فیصلہ کرنے بیٹھیں۔

(ٹائمس آف انڈیا، نئی دہلی، ۱۸ مئی ۱۹۸۵)

فاضل جج نے اپنے ۱۸ صفحات کے فیصلے میں مزید لکھا:

Banning of the Koran would amount to abolition of the Muslim religion itself, as it could not exist without the Koran. Such action is unthinkable. Further, it would take away the secularity of India and violate Article 25 of the constitution which guarantees all people freedom of conscience and right to profess, practise and to propagate religion.

The Times of India (New Delhi) May 18, 1985

قرآن پر پابندی لگانا خود مسلمانوں کے مذہب کو ختم کرنے کے ہم معنیٰ ہوگا۔ کیوں کہ قرآن کے بغیر

اس کا وجود ممکن نہیں۔ اس طرح کی کارروائی ناقابل قیاس ہے۔ مزید یہ کہ یہ ہندستان کے سیکولرزم کو ختم کردے گا اور دستور کی دفعہ ۲۵ کے خلاف ہوگا۔ جو کہ تمام باشندوں کو ضمیر کی آزادی کی ضمانت دیتی ہے اور عقیدہ اور عمل اور مذہبی تبلیغ کا آزادانہ حق تسلیم کرتی ہے۔

زمانہ کا فرق

یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ قدیم مکہ اور جدید ہندستان میں یہ فرق کیوں ہے۔ کیا وجہ ہے کہ قدیم مکہ کے لوگوں نے قرآن پر پابندی لگانا چاہا اور وہ اس میں پوری طرح کامیاب ہوگئے۔ اس کے برعکس جدید ہندستان میں کچھ افراد کی طرف سے قرآن پر پابندی لگانے کی کوشش کی گئی۔ مگر خود حکومت اور عدالت نے پابندی لگانے کے اس منصوبہ کی شدید مخالفت کی اور آخر کار اس کو مکمل طور پر رد کردیا گیا۔

اس فرق کی وجہ زمانہ کا فرق ہے۔ قدیم زمانہ مذہبی تشدد کا زمانہ تھا۔ موجودہ زمانہ مذہبی آزادی کا زمانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانہ میں دوسرے مذہب کو برداشت نہیں کیا گیا۔ اور موجودہ زمانہ میں ہر مذہب کے لیے آزادی کا حق تسلیم کیا جارہا ہے۔

قدیم رواج کے مطابق یہ بالکل جائز فعل تھا کہ ایک شخص اگر قومی مذہب کے سوا کوئی اور مذہب اختیار کرے تو اس پر روک لگائی جائے۔ اس پر سختیاں کی جائیں۔ حتیٰ کہ اس کو مار ڈالا جائے۔ مگر موجودہ زمانہ میں جو فکری اور علمی انقلاب ہوا ہے، اس نے انفرادی آزادی کو آخری حد تک مقدس قرار دے دیا ہے۔ اب ہر شخص کے لیے یہ حق بلا شرط تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ آزاد ہے کہ جو مذہب چاہے اختیار کرے، جس مذہب پر چاہے عمل کرے اور جس مذہب کو چاہے پُرامن طور پر اس کی تبلیغ کرے۔ یہ موجودہ زمانہ میں ہر آدمی کا ایک مسلمہ حق ہے۔

مذہبی تشدد کے دور میں قرآن پر پابندی لگادی گئی تھی۔ مگر مذہبی آزادی کے دور میں اس پر پابندی لگانے کی کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔ یہ واقعہ دونوں زمانوں کے فرق کی ایک واضح مثال ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج دنیا کے حالات اس سے بالکل مختلف ہیں جو ڈیڑھ ہزار سال پہلے قدیم مکہ میں پائے جاتے تھے۔

دور جدید کی اس تبدیلی کو سمجھنے کے لیے یہاں ہم ایک اور واقعہ کا حوالہ دیں گے۔ اس

واقعہ کا تعلق اسپین سے ہے - یہ واقعہ بھی اسی سال پیش آیا - یعنی ۱۹۸۵ کے آغاز میں - یہ واقعہ عربی مجلہ "العربی" میں تفصیل کے ساتھ باتصویر انداز میں شائع کیا گیا ہے -

اسپین کی مثال

"العربی" عربی زبان کا ایک مشہور ادبی اور ثقافتی ماہنامہ ہے - وہ کویت کی وزارۃ الاعلام کی طرف سے شایع ہوتا ہے - اس کی اشاعت رمضان ۱۴۰۵ھ (جون ۱۹۸۵ء) میں ایک مضمون چھپا ہے جس کا عنوان ہے :

عبد الرحمٰن الداخل یعود الی الاندلس

(عبد الرحمٰن الداخل اسپین میں واپس آتا ہے) یہ ڈاکٹر عفیف بھنسی کا مضمون ہے - وہ ایک مخصوص تقریب میں شرکت کے لیے اسپین گئے تھے - واپس آکر انھوں نے یہ مفصل مضمون شایع کیا ہے -

عبد الرحمٰن الداخل اُموی خاندان کا ایک شاہزادہ تھا - وہ ۱۱۳ھ (۷۳۲ء) میں پیدا ہوا - اس کی عمر بیس سال کی تھی کہ عباسیوں نے دمشق کی اُموی خلافت پر غلبہ حاصل کر لیا - یہ واقعہ ۷۵۰ء میں ہوا - اس کے بعد وہ بنو امیہ کے افراد کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کرنے لگے - نوجوان عبد الرحمٰن نے بھاگ کر دریائے فرات کے کنارے ایک باغ میں پناہ لی - عباسیوں کے سپاہی وہاں بھی پہونچ گئے - عبد الرحمٰن فرات میں کود گیا اور تیر کر دریا کے دوسری طرف نکل گیا -

اس کے بعد وہ بھیس بدل کر سفر کرتا رہا - وہ دمشق سے فلسطین پہونچا - وہاں سے مصر گیا پھر تیونس پہونچا جو افریقہ کا ایک ساحلی ملک ہے - وہاں سے وہ ایک کشتی پر سوار ہوا اور سمندری سفر کرتے ہوئے اسپین کے اس ساحلی مقام پر اترا جس کو المونیکر (Almunecar) کہا جاتا ہے - دمشق سے اسپین تک پہنچنے میں اس کو پانچ سال لگ گئے - وہ ۱۳۸ھ (۷۵۶ء) میں اسپین کی زمین میں داخل ہوا -

یہی عبد الرحمٰن الداخل اموی وہ شخص ہے جس نے اسپین میں عرب سلطنت قائم کی اور یورپ میں تہذیب کے عہد کا آغاز کیا - اسپین کا فاتح طارق ابن زیاد ہے مگر اسپین میں باقاعدہ مسلم سلطنت قائم کرنے والا عبد الرحمٰن الداخل ہی تھا -

اسپین میں مسلمانوں نے ۸ سو سال تک حکومت کی۔ پھر ان کے باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر عیسائیوں نے ان کو مغلوب کر لیا۔ اس کے بعد عیسائیوں نے ایک ایک مسلمان کو یا تو قتل کر دیا یا اسپین سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اسپین سے ہر مسلم نشان کو بالکل مٹا دیا گیا۔

۱۹۸۵ میں عبدالرحمٰن الداخل کی وفات کو بارہ سو سال پورے ہوئے ہیں۔ اس مناسبت سے اس سال المونیکر (اسپین) میں اس عرب حکمراں کی ۱۲۰۰ سو سالہ برسی منائی گئی۔ یہ مقام سمندر کے کنارے غرناطہ سے قریب ہے۔ غرناطہ اسپین کی آخری مسلم سلطنت کی راجدھانی تھا۔ اس تاریخی تقریب میں اسپین کے ممتاز افراد اور عرب کے علماء اور سفراء شریک ہوئے۔ اس کی صدارت اسپین کی ملکہ صوفیا نے کی۔ عبدالرحمٰن الداخل نے اسپین میں ۳۲ سال تک حکومت کی۔ اور پھر اسی ملک میں اس کا انتقال ہوا۔

اس تقریب کے موقع پر جو مختلف کارروائیاں ہوئیں ان میں سے ایک کارروائی یہ تھی کہ عبدالرحمٰن الداخل کا ایک بہت بڑا اسٹیچو تیار کیا گیا اور اس کو المونیکر میں سمندر کے کنارے ایک پرفضا مقام پر لگایا گیا۔ اس اسٹیچو کا فوٹو ماہنامہ العربی (جون ۱۹۸۵) میں شائع ہوا ہے۔ اسٹیچو میں عبدالرحمٰن الداخل اپنے داہنے ہاتھ میں تلوار لیے ہوئے کھڑا ہے اور پُراعتماد چہرے کے ساتھ اسپین کی سرزمین کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اسٹیچو کے نیچے العربی نے یہ الفاظ لکھے ہیں:

تمثال عبد الرحمٰن الداخل فی المنکب من الخلف

یعنی المونیکر میں عبدالرحمٰن الداخل کے اسٹیچو کی تصویر پیچھے کی طرف سے۔

اسپین میں مسلمانوں کی حکومت آخری طور پر ۱۴۹۲ء (۸۹۷ھ) میں ختم ہوئی۔ اس کے بعد وہاں کی عیسائی حکومت نے مسلمانوں پر سخت ترین مظالم شروع کیے۔ مسلمان یا تو اسپین سے بھاگ گئے یا انہیں قتل کر دیا گیا۔ ۸۰۰ سو سالہ حکومت کے بعد اسپین سے ایک ایک مسلمان کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد سے اسپین سب سے بڑا مسلم دشمن ملک بنا ہوا تھا۔

اب اسی ملک میں ۱۹۸۵ میں یہ واقعہ ہوتا ہے کہ وہاں قدیم مسلم فاتح کی یاد منائی جاتی ہے۔ اور اس کی مستقل یادگاریں قائم کی جاتی ہیں۔ ایسا ہونا ایک بے حد غیر معمولی بات ہے۔ یہاں گویا ایک ختم شدہ تاریخ پھر سے اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ تاریخ کے مٹے ہوئے صفحات دوبارہ انہیں

لوگوں کے ہاتھوں سے لکھے جا رہے ہیں جنہوں نے اس سے پہلے ان کو مٹا دیا تھا۔

علمی اور تاریخی نقطۂ نظر

ایسا کیوں کر ممکن ہوا۔ اس کی وجہ جدید انقلاب ہے۔ جدید ذہنی انقلاب نے قدیم طرز کے تعصب کا خاتمہ کر دیا ہے۔ جدید ذہن کے تحت وہ ماضی دوبارہ دلچسپی کا موضوع بن گیا ہے جو اس سے پہلے صرف نفرت اور فراموشی کا موضوع بنا ہوا تھا۔ متعصبانہ طرز فکر نے جس چیز کو رد کر دیا تھا تاریخی طرز فکر نے اس کو قبول کر لیا۔ العربی کے مضمون نگار نے لکھا ہے:

ونظرا لاهمية عبد الرحمٰن وعهد الخلافة في تاريخ حضارة الاندلس راى المسئولون في الاندلس اليوم انه من الاهمية توضيح اعمال و شخصية هذا الحاكم الاموى الشجاع والعظيم (صفحہ ۱۶۶)	اسپین کے تمدن کی تاریخ میں عبدالرحمٰن اور عہد خلافت کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے وہاں کے موجودہ ذمہ داروں نے محسوس کیا کہ یہ ایک اہم ضرورت ہے کہ بنو امیہ کے اس بہادر اور عظیم حکمراں کی شخصیت اور اس کے کارناموں کو نمایاں کیا جائے۔

موجودہ زمانہ میں عقلیت کا غلبہ ہے۔ آج کا انسان ہر معاملہ میں عقلی نقطۂ نظر (Rational approach) کو پسند کرتا ہے۔ اس نقطۂ نظر نے جدید انسان کے تمام معاملات پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اسی میں سے وہ تبدیلی بھی ہے جس کی ایک مثال ہندستان اور اسپین کے ان واقعات میں نظر آتی ہے جن کو ابھی ہم نے بیان کیا۔

جدید انسان پر جب عقلی نقطۂ نظر کا غلبہ ہوا تو اس کو یہ بات بالکل بے معنی معلوم ہوئی کہ اسپین کی مسلم حکومت کے آٹھ سو سال جو ایک تاریخی حقیقت ہیں ان کو نظر انداز کیا جائے۔ مزید یہ کہ یہ آٹھ سو سالہ دور محض حکمرانی کا دور نہ تھا بلکہ وہ ایک شاندار تہذیب کا دور تھا۔ حتیٰ کہ اس دور میں پیدا ہونے والی تہذیب ہی بالآخر یورپ کی جدید تہذیب کی بنیاد بنی۔ اسپین کی جدید نسل پر جب عقلی طرز فکر کا غلبہ ہوا تو انہوں نے محسوس کیا کہ مسلم تاریخ کو نظر انداز کر کے وہ خود اپنی تاریخ کے ایک اہم باب کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ غیر عقلی نقطۂ نظر نے جس واقعہ کو نفرت کے خانہ میں ڈال رکھا تھا۔ عقلی نقطۂ نظر نے اس واقعہ کو دلچسپی کے خانہ میں ڈال دیا۔

پہلے جو چیز صرف غیر کی نظر آتی تھی وہ اب خود اپنی چیز نظر آنے لگی۔

یہی معاملہ ہندستان کا بھی ہے۔ ہندستان میں بعض انتہا پسند لوگ ایسے موجود ہیں جو اپنے متعصبانہ ذہن کی وجہ سے قرآن پر پابندی لگا دینا چاہتے ہیں۔ مگر یہاں کا جو تعلیم یافتہ طبقہ ہے، جو ملک کو ترقی کی طرف لے جانا چاہتا ہے، وہ جانتا ہے کہ قرآن پر پابندی لگانا ساری دنیا میں اپنے کو فکری اچھوت بنا لینے کے ہم معنیٰ ہوگا۔ کیوں کہ آج کا تعقل پسند انسان آزادیٔ خیال کو سب سے بڑی چیز سمجھتا ہے۔ عقیدہ اور مذہب کی آزادی آج کی دنیا کا ایک تسلیم شدہ اصول ہے۔ عالمی فکر کا یہی دباؤ ہے جس کی وجہ سے ہندستان کی عدالت اور حکومت نے قرآن پر پابندی لگانے کی تحریک کو خود ہی کچل دیا۔

آج کی ضرورت

اس قسم کے واقعات جو آج کی دنیا میں پیش آرہے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ آج ہمارے لیے اسلامی دعوت کے نئے امکانات کھل گیے ہیں۔ آج اس کا امکان پیدا ہو گیا ہے کہ کسی روک ٹوک کے بغیر کھلی فضا میں خدا کا پیغام خدا کے بندوں تک پہونچایا جا سکے۔ دور قدیم کے داعیوں نے جو کام مذہبی پابندی کے ماحول میں انجام دیا تھا وہ کام آج مذہبی آزادی کے ماحول میں انجام دیا جا سکتا ہے۔ جس دعوتی کام کو انھوں نے متعصبانہ رکاوٹوں کے درمیان انجام دیا تھا، اس کو آج رواداری اور غیر جانب داری کی فضا میں انجام دیا جا سکتا ہے۔ جس کام کو انھوں نے ہٹ دھرمی کے حالات میں انجام دیا تھا اس کو آج معقولیت پسندی کے حالات میں انجام دیا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے فکری انقلاب نے اسلامی دعوت کے لیے بالکل نئے دروازے کھول دیئے ہیں۔ اب دعوت کے لیے ایسے موافق امکانات پیدا ہو گیے ہیں جو اس سے پہلے کبھی دنیا میں موجود نہ تھے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ ہم ان امکانات کو جانیں اور انھیں ہوش مندی کے ساتھ اسلامی دعوت کے لیے استعمال کریں۔

موجودہ زمانے میں کسی فکر کی تبلیغ واشاعت کے لیے جو نئے مواقع کھلے ہیں ان پر سب سے زیادہ حق خدا کے دین کا ہے اور ان کو سب سے زیادہ خدا کے دین کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے۔

مسلمانوں کی ذمہ داری

مسلمان ختم نبوت کے بعد مقام نبوت پر ہیں۔ ان کی یہ لازمی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کے پیغام رحمت کو دنیا کی تمام قوموں تک پہنچائیں۔ ایک طرف یہ حقیقت ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کے حالات اور دنیا کے حالات کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے دوسرے تمام دروازے عملاً مسلمانوں کے لیے بند کرکے صرف ایک دروازہ ان کے لیے کھلا رکھا ہے۔ اور وہ دعوت الی اللہ کا راستہ ہے۔

مسلمان پچھلے سو سال سے ساری دنیا میں جدوجہد کر رہے ہیں۔ مگر ان کی جدوجہد صرف لاحاصل انجام پر ختم ہو رہی ہے۔ بعض ملکوں میں وہ قومی جدوجہد کر رہے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انھیں داخلوں اور ملازمتوں اور ممبریوں میں رزرویشن دیا جائے۔ مگر اس جدوجہد سے اب تک بے فائدہ احتجاج کے سوا اور کچھ ان کے حصہ میں نہیں آیا ہے۔ بعض ملکوں میں وہ سیاسی جدوجہد کر رہے ہیں۔ یعنی اسلام کو سیاسی نظام کی حیثیت سے قائم کرنا۔ مگر یہاں بھی پُرشور کوششوں کے باوجود بے فائدہ اکھیڑ پچھاڑ کے سوا اور کچھ انھیں حاصل نہ ہو سکا۔ بعض ملکوں میں وہ صنعت اور ٹکنالوجی کی راہ سے آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ مگر یہاں بھی ایک حقیقت ان کی راہ میں حائل ہے۔ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ ابھی تک انڈسٹریل ایج میں بھی داخل نہیں ہوئے اور دنیا آگے بڑھ کر سُپر انڈسٹریل ایج میں داخل ہو چکی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میدان میں ان کے لیے اس کے سوا کچھ اور مقدر نہیں کہ وہ ہمیشہ دوسری قوموں کے پیچھے چلتے رہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ زندگی کا راز اقدام میں ہے نہ کہ تقلید اور احتجاج جیسی کارروائیوں میں۔ اور اللہ تعالیٰ نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو اس حال میں کر دیا ہے کہ وہ دعوت کے سوا کسی اور راہ میں حقیقی اقدام کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ گویا مسلمان آج کا فرمانِ الٰہی ناچار مسلمان شو کی منزل میں ہیں۔ وہ یا تو دعوت کی راہ میں آگے بڑھنے کے لیے اٹھیں گے یا بے حقیقت ہو کر رہ جائیں گے۔ مزید یہ کہ موجودہ زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک پورا دور پیدا کیا ہے جس نے دعوت کے بے پناہ امکانات کھول دیئے ہیں۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ ان کو سمجھ کر انھیں استعمال کیا جائے۔

الرسالہ دسمبر ۱۹۸۷

حصّہ دوم

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے، یقیناً مشکل کے ساتھ آسانی ہے
(فان مع العسر یسرا، ان مع العسر یسرا، الانشراح)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کو بنانے والے نے اس کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں کوئی مشکل صرف مشکل نہیں ہوتی۔ ہر مشکل میں ایک آسانی موجود ہوتی ہے۔ ہر ڈس ایڈوانٹج میں ایک ایڈوانٹج کا پہلو چھپا ہوا ہوتا ہے۔ جس طرح کانٹے کے ساتھ پھول ہوتا ہے، اسی طرح ہر ناکامی اپنے ساتھ کامیابی کا ایک نیا امکان لیے ہوئے ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حالات خواہ کتنے ہی زیادہ سخت ہو جائیں اس دنیا میں آدمی کے لیے مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔ وہ از سرِ نو عمل کرکے دوبارہ اپنے حالات کو بہتر بنا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا عقل کا امتحان ہے۔ اس دنیا میں کامیابی کے لیے سب سے زیادہ اہم شرط بالغ نظری ہے۔ یہاں وہ شخص یا گروہ کامیاب ہوتا ہے جو ظاہری مشکل کے اندر چھپی ہوئی آسانی کو دیکھ لے۔ جو ناموافق حالات (Disadvantage) میں موافق پہلو (Advantage) کو دریافت کرلے۔

اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ مومن کی ہوشیاری سے بچو، کیوں کہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے (اتقوا فراسة المومن فانه ینظر بنور الله) خدا کی نگاہ دور رس نگاہ ہے۔ وہ واقعہ کے تمام پہلوؤں کو دیکھ لیتی ہے اور جو واقعہ کے تمام پہلوؤں کو دیکھ لے اس کی طاقت کا کوئی ٹھکانا نہیں۔

اصل یہ ہے کہ ایک انسانی نگاہ ہوتی ہے اور ایک ربانی نگاہ۔ انسانی نگاہ محدود ہوتی ہے اور ربانی نگاہ لامحدود۔ عام انسان خدا کے فیض سے محروم ہوتا ہے اس لیے وہ کسی چیز کو صرف انسانی نگاہ سے دیکھ پاتا ہے۔ ایسا آدمی کسی واقعہ کے صرف سطحی پہلو کو دیکھتا ہے۔ اگر وہ بظاہر اپنے کو مشکل حالات میں پائے تو شکایت کا دفتر لے کر بیٹھ جائے گا۔ وہ مایوسی کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ مگر مومن خدا کے فیض کو پائے ہوئے ہوتا

ہے اس لیے اس کو ربانی نگاہ حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ حقیقتوں کو بہت دور تک دیکھتا ہے۔ وہ کسی چیز کے سطحی پہلو میں نہیں اٹکتا بلکہ وہ اس کو اس کی گہرائی تک جان لیتا ہے۔

قرآن کی آیت (ان مع العسر یسرا) کی روشنی میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مومن عُسر میں یُسر کو دیکھ لیتا ہے۔ وہ مشکل میں آسانی کا راز پالیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شکایت اور احتجاج مومن کا طریقہ نہیں۔ مومن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ تاریکی میں روشنی کا راز دریافت کرے اور اعتماد کے ساتھ اپنی منزل کی طرف چل پڑے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے نگاہ ربانی کو کھو دیا ہے وہ چیزوں کو صرف نگاہ انسانی سے دیکھنا جانتے ہیں، وہ چیزوں کو نگاہ ربانی سے دیکھنا نہیں جانتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے معاملات میں صرف عُسر کے پہلو کو دیکھتے ہیں، وہ اپنے معاملات میں یُسر کے پہلو کو نہیں دیکھ پاتے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا شکایت اور احتجاج میں مبتلا ہونا صرف یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ اُس چیز سے محروم ہیں جس کو حدیث میں فراست مومن کہا گیا ہے۔

قرآن کے خلاف کلکتہ ہائی کورٹ میں جو مقدمہ دائر کیا گیا تھا اُس کے بارے میں ہمارے تمام لکھنے والوں نے لکھا اور ہمارے تمام بولنے والوں نے اس پر کلام کیا۔ مگر ہر ایک کو صرف اس کا تاریک پہلو نظر آیا۔ ہر ایک اس کو ظلم اور تعصب کا واقعہ قرار دے کر اس کے خلاف چیخ پکار کرتا رہا۔ مجھے کوئی قابل ذکر مسلمان نہیں معلوم جس نے اس واقعہ میں اس کے روشن پہلو کو دیکھا ہو۔ جس نے یہ دریافت کیا ہو کہ ہائی کورٹ نے اس مقدمہ کو خارج کرکے اس حقیقت کا قانونی اعلان کیا ہے کہ اس ملک میں ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ لوگوں کو اس واقعہ میں صرف مذہبی تعصب نظر آیا۔ وہ اس میں مذہبی آزادی کے پہلو کو نہ دیکھ سکے۔

یہی معاملہ اسپین کا ہے۔ اسپین میں مسلمان دوبارہ آباد ہو رہے ہیں۔ وہاں سلطان عبدالرحمٰن الداخل کو دوبارہ مقام دیا گیا ہے۔ میں نے اس واقعہ کا ذکر بعض تعلیم یافتہ مسلمانوں سے کیا۔ آپ تعجب کریں گے کہ ان کا جواب یہ تھا کہ یہ عیسائیوں کی کوئی نئی سازش معلوم ہوتی ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک واقعہ میں کھلا ہوا روشن پہلو ہے مگر وہ لوگوں کو نظر نہیں آتا۔

البتہ اس میں موہوم سازش کا امکان انھیں بخوبی دکھائی دے رہا ہے۔

یہ صورت حال بتاتی ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان ایک قسم کے ذہنی فاقہ (Intellectual starvation) سے دوچار ہیں۔ وہ نہایت شدید قسم کے فکری افلاس میں مبتلا ہیں۔ انھوں نے یہ صلاحیت کھودی ہے کہ وہ واقعات کا گہرا تجزیہ کرسکیں۔ وہ چیزوں کو اس کے ظاہری اور باطنی دونوں پہلوؤں سے جانچ کر ان کے بارے میں صحیح فیصلہ کرسکیں۔ وہ حالات کے ظاہری طوفان کے ساتھ اس کے تہہ میں پائی جانے والی پُرسکون لہروں کو بھی دیکھ لیں اور گہری معرفت کے ساتھ اپنے سفر کی سمت متعین کریں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے جو کچھ لکھ رہے ہیں اور بول رہے ہیں وہ مشترک طور پر صرف ایک ہے۔ دوسروں کے خلاف چیخ پکار۔ مسلمانوں کے کسی بھی بیان کو دیکھئے، کسی بھی ملک میں جاکر ان سے ملاقات کیجئے۔ ان کی کسی بھی کانفرنس میں شرکت کیجئے۔ ہر جگہ ایک ہی ذہن کام کرتا ہوا نظر آئے گا۔ آج دنیا بھر کے مسلمانوں کے ذہن پر یہ چھایا ہوا ہے کہ کچھ اسلام دشمن قومیں ہیں جو ان کو ستا رہی ہیں۔ غیر قوموں کا ظلم، ان کا تعصب اور ان کی سازش یہی وہ چیزیں ہیں جن کو آج کے مسلمان جانتے ہیں۔ ان کے سوا کسی اور چیز کی انھیں خبر نہیں۔

۵۰ سال پہلے امیر شکیب ارسلان نے ایک کتاب لکھی جس کا نام تھا لماذا تأخّر المسلمون وتقدم غیرھم (مسلمان کیوں پیچھے ہوگئے اور دوسرے لوگ کیوں آگے ہوگئے) مگر اس لمبی مدت میں مسلمانوں کے قائدین اس سوال کا کوئی جواب اس کے سوا دریافت نہ کرسکے کہ وہ دوسروں کو اپنی بربادی کا ذمہ دار قرار دے کر ان کے خلاف شکایت اور احتجاج کرتے رہیں۔ مسلمان موجودہ زمانہ میں صرف عسر کو دیکھنے کے ماہر بنے ہوئے ہیں وہ یُسر کو دیکھنے کے ماہر نہ بن سکے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی بربادی کا اصل سبب ظالموں کا ظلم نہیں بلکہ خود مسلمانوں کا اپنا ذہنی افلاس ہے۔ مسلمان اپنے غلط ذہن کی وجہ سے اس قیمتی فکری غذا سے محروم ہو رہے ہیں جو ان کے چاروں طرف خدا نے ان کے لیے مہیا کر رکھی ہے۔ وہ اعلیٰ ترین مواقع کے

کنارے کھڑے ہو کر یہ محسوس کر رہے ہیں کہ ان کے لیے آگے بڑھنے کا کوئی موقع نہیں۔ وہ حالات کو دیکھ رہے ہیں مگر وہ امکانات کو نہیں دیکھتے۔ ان کی نگاہ "کیا ہے" پر اٹکی ہوئی ہے۔ "کیا ہو سکتا ہے" تک ان کی نگاہ ابھی نہیں پہونچی۔

قرآن مجید میں حضرت موسیٰ اور فرعون کے قصہ میں بتایا گیا ہے کہ ایک بڑے میدان میں فرعون نے مصر کے جادوگروں کو جمع کیا۔ ان جادوگروں نے اپنی رسیاں اور لکڑیاں میدان میں ڈالیں۔ جادو کے زور سے یہ رسیاں اور لکڑیاں سانپ کی طرح میدان میں دوڑنے لگیں۔ یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ کے دل میں ڈر پیدا ہوا۔ بشری تقاضے کے تحت انہیں یہ محسوس ہوا کہ سانپوں کی اس فوج کا مقابلہ وہ کس طرح کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ ڈرو مت، تمہیں غالب رہو گے۔ تمہارے ہاتھ میں جو عصا ہے اس کو ڈال دو۔ یہ عصا ان کے تمام سانپوں کو نگل جائے گا۔ کامیابی تمہارے لیے ہے نہ کہ ان کے لیے۔ اس ہدایت کے تحت حضرت موسیٰ نے اپنا عصا زمین پر پھینکا۔ اچانک یہ عصا تمام سانپوں سے بڑا سانپ بن گیا۔ جب وہ میدان میں چلا تو جادوگروں کے تمام سانپ اس طرح ختم ہو گئے جیسے کہ ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ (طٰہٰ ۶۹ - ۶۶)

مسلمانوں کا حال موجودہ زمانہ میں بلا تشبیہ ایسا ہی ہو رہا ہے۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص عصائے موسیٰ اپنے بغل میں لیے ہوئے ہو اور پھر بھی سانپوں سے ڈرتا ہو۔ جیسے کسی کو اللہ نے معجزاتی طاقت دے رکھی ہو مگر وہ جادوگروں کے جادو اور نظربندوں کی نظربندی کو دیکھ کر کانپ رہا ہو۔ جیسے خدا کا قانون پوری طرح کسی کا ساتھ دینے کے لیے موجود ہو مگر وہ انسانوں کے جھوٹے فریب کو دیکھ کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے۔

وسیع تبدیلیاں

صلیبی جنگوں (Crusades) کے بعد یورپ کے عیسائی علماء اسلام کی تعلیمات اور اس کی تاریخ کو بگاڑ کر پیش کرتے تھے۔ مگر سائنس کے زور سے انیسویں صدی میں ایک نیا دور شروع ہوا۔ سائنس میں جن چیزوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے ان میں قطعیت (Exactness) کی بے حد اہمیت ہوتی ہے۔ اس طرح سائنس کے اثر سے جدید قوموں میں قطعی طرزِ فکر

(Exact thinking) کو ترقی ہوئی اور حقیقت پسندی کا انداز پیدا ہوا۔

اس حقیقت پسندانہ طرز فکر کا اثر تمام شعبوں پر پڑا۔ اور اسی طرح اسلام کے مطالعہ پر بھی۔ چنانچہ اب یہ ذہن پیدا ہوا کہ اسلام کی تعلیمات اور اس کی تاریخ کو ویسا ہی لیا جائے جیسا کہ وہ ہیں۔ اس کے بعد استشراق (Orientalism) کا ایک نیا دور شروع ہوا جس میں اسلام کو زیادہ حقیقی انداز میں پیش کیا جانے لگا۔

روس اور چین میں کمیونسٹ انقلاب کے بعد ابتدائی دور میں مذہب کے خلاف سخت ردعمل پیدا ہوا تھا مگر اب وہاں بھی عالمی دباؤ کے تحت اعتدال پیدا ہو رہا ہے اور مذہب کو دوبارہ آزادی دی جا رہی ہے۔ قدیم زمانہ میں ایک مذہب کے لوگ دوسرے مذہب کے خلاف صرف مناظرہ بازی کرنا جانتے تھے۔ آج عالمی سطح پر بے شمار مشترک اجتماعات ہو رہے ہیں جن میں ہر مذہب کے لوگ اپنی تعلیمات کو پیش کرتے ہیں اور دوسرے مذہب کے لوگ اس کو سنجیدگی کے ساتھ سنتے ہیں۔ خود مجھے ایسے کئی اجتماعات میں شرکت کا اتفاق ہوا ہے۔ دنیا کی تمام یونیورسٹیوں میں عربی زبان اور اسلامیات کے شعبے بہت بڑے پیمانہ پر کھولے گیے ہیں جن میں خالص علمی اور تاریخی انداز میں اسلام کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ مغربی دنیا کے غیر مسلم علماء بڑی تعداد میں عربی زبان پڑھ رہے ہیں۔ وہ مغربی زبانوں میں قرآن وحدیث کے ترجمے کر رہے ہیں۔ وہ قدیم عربی کتابوں کو ایڈٹ کرکے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔ وہ اسلام کے بارے میں تاریخی اور تحقیقی کتابیں لکھ رہے ہیں۔ وغیرہ

موجودہ زمانہ میں جس طرح سواری، خبر رسانی اور صنعت وزراعت میں زبردست تبدیلی ہوئی ہے۔ اسی طرح افکار وخیالات کے اعتبار سے بھی آج کی دنیا میں زبردست تبدیلی ہوئی ہے۔

یہ تبدیلی عین اسلامی دعوت کے حق میں ہے۔ اس تبدیلی نے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ جو کام پہلے سخت رکاوٹوں کے درمیان انجام دینا پڑتا تھا اس کو سہولتوں اور آسانیوں کے درمیان انجام دیا جائے۔ جو کام پہلے بے اعترافی کے ماحول میں کیا جاتا تھا وہ اب اعتراف کے ماحول میں کیا جائے۔ جو کام پہلے ہٹ دھرمی کی فضا میں کرنا پڑتا تھا

اس کو اب معقولیت کی فضا میں کیا جا سکے ۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کے زبردست نئے امکانات کھل گئے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل سے موجودہ زمانہ میں ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں کہ کسی رکاوٹ کے بغیر اسلامی دعوت کا کام شروع کیا جا سکے ۔ اور ہر قسم کے جدید وسائل کو استعمال کرتے ہوئے اس کو آخری حد تک پہونچایا جائے ۔

آج ساری دنیا کے مسلمانوں کو غیر اقوام سے ظلم اور تعصب کی شکایت ہے ۔ اس شکایتی ذہن کا یہ نتیجہ ہے کہ انھیں جدید دنیا کے وہ دوسرے پہلو نظر نہیں آتے جو عین انھیں حالات میں اسی دنیا کے اندر موجود ہیں اور جو ہمارے لیے زبردست امید کی حیثیت رکھتے ہیں ۔

انھیں مظاہر میں سے ایک بہت نمایاں مظہر یہ ہے کہ آج بھی ہر روز ہزاروں کی تعداد میں دوسری قوموں کے لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں ۔ افریقہ کے صرف ایک ملک روانڈا میں پانچ سال کے اندر ۲۵ ہزار آدمیوں نے اسلام قبول کیا ہے ۔ فرانس میں کیتھولک عیسائیوں کے بعد اسلام دوسرا سب سے بڑا مذہب بن چکا ہے ۔ برطانیہ ، امریکہ ، جاپان میں ہر جگہ روزانہ کثرت سے لوگوں کے اسلام قبول کرنے کی خبریں آرہی ہیں ۔ دنیا کے تمام بڑے شہروں میں عالی شان اسلامی مرکز بن رہے ہیں ۔ روم جو کسی وقت اسلام دشمنی کا سب سے بڑا مرکز تھا ، وہاں عین شہر کے اندر بہت بڑی مسجد اور اسلامک سنٹر تعمیر کیے گئے ہیں ۔ اسپین کے نومسلموں نے غرناطہ سے ایک اخبار جاری کیا ہے جس کا نام ہے : Pais Islamico

اسپین کے نومسلم ڈاکٹر عمر فاروق عبد اللہ نے ۱۹۸۴ میں حج کا فریضہ ادا کیا ۔ اس موقع پر انھوں نے ایک انٹرویو (یقین انٹرنیشنل کراچی ، ۲۲ مئی ۱۹۸۵) میں بتایا کہ جنرل فرانکو (۱۹۷۵ — ۱۸۹۲) کے بعد اسپین کے حالات بہت بدل گئے ہیں ۔ اب غرناطہ میں بہت بڑا اسلامک سنٹر بنایا گیا ہے ۔ وہاں ہر شہر میں مسلمان نظر آنے لگے ہیں ۔ اس درمیان میں پانچ سو اسپینیوں نے اسلام قبول کر لیا ہے ۔ انھوں نے کہا کہ اسپین کے موجودہ ذمہ دار کھلے ذہن کے لوگ ہیں اور رواداری نقطہ نظر رکھتے ہیں :

the present Spanish authorities are open-minded and tolerant in their attitude.

غرض ساری دنیا میں آج اسلام کی مسلسل اشاعت ہو رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام آج بھی نظریاتی اعتبار سے اقدام کی پوزیشن میں ہے۔ آج جب کہ مسلمان ہر جگہ مغلوب ہو رہے ہیں، عین اسی وقت اسلام ہر جگہ دلوں پر فتح حاصل کر رہا ہے۔ مسلمان اگر اسلام کی جدید تاریخ کے اس دوسرے پہلو کو دیکھ سکیں تو وہ پائیں گے کہ جن حالات کے خلاف وہ فریاد و ماتم میں مشغول ہیں وہ حالات انہیں کرنے کا عظیم الشان پروگرام دے رہے ہیں۔

ایک بیرونی سفر کے دوران مجھے ایک جاپانی نومسلم سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے کہا کہ جاپان میں اسلام کی اشاعت کے زبردست امکانات ہیں مگر اس امکان سے ابھی تک پورا فائدہ نہیں اٹھایا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جاپانیوں کے سامنے تو بس سادہ طور پر ان کی اپنی زبان میں اسلام پیش کر دینے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ان کی اکثریت اسلام قبول کر لے گی۔ انھوں نے کہا کہ جاپانی لوگ تو بالقوہ مسلمان ہی ہیں:

Japanese people are potentially Muslims.

ایک انٹرنیشنل سیمنار میں میری ملاقات ایک مسلمان پروفیسر سے ہوئی جو کناڈا کی ایک یونیورسٹی میں استاد ہیں۔ انھوں نے مغربی دنیا کے جدید امکانات کو بتاتے ہوئے کہا کہ کناڈا میں اسلامی دعوت کے زبردست مواقع ہیں۔ حتیٰ کہ وہاں اسلامی دعوت کا کام خود حکومت کے مالی تعاون سے اعلیٰ پیمانہ پر کیا جا سکتا ہے۔ کناڈا کی حکومت ہر پُرامن اسکیم میں اپنے شہریوں کی مدد کرتی ہے۔ مزید یہ کہ وہ اس تعاون کی قیمت اس شکل میں وصول نہیں کرتی کہ وہ ہماری کارکردگی میں غیر ضروری مداخلت کرے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس امکان سے دوسرے مذاہب کے لوگ بہت بڑے پیمانہ پر فائدہ اٹھا رہے ہیں مگر مسلمان ابھی تک اس سے محروم ہیں کیوں کہ مسلمانوں نے سیاسی چیخ پکار کو کام سمجھ رکھا ہے۔

صلح حدیبیہ کا پیغام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں کے مظالم سے تنگ آکر مکہ چھوڑ دیا اور مدینہ

کی طرف ہجرت فرمائی۔ تاہم مکہ والوں کا غصہ ختم نہیں ہوا۔ انھوں نے اسلام کو مٹانے کے لیے اسلام کے خلاف باقاعدہ جنگ چھیڑ دی۔ اب مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان جنگ پر جنگ ہونے لگی۔ ہر طرف جنگی فضا پیدا ہو گئی۔ اس جنگی فضا کی وجہ سے اسلام کا دعوتی کام تقریباً ٹھپ ہو گیا۔

ہجرت کے چھٹے سال ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عربوں کے پاس اسلام کے لیے نفرت اور تعصب کے سوا اور کچھ نہیں۔ مسلسل جنگی حالات کے نتیجے میں اسلامی تاریخ معطل ہو کر رہ گئی۔ بظاہر اسلام کے لیے ملک میں کوئی روشن امکان نظر نہیں آتا تھا۔

مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے خصوصی فیضان سے یہ جان لیا کہ اس ظاہر کے اندر ایک اور باطن چھپا ہوا ہے۔ اوپر کی سطح پر اگرچہ نفرت اور تشدد نظر آرہا ہے مگر نیچے کی سطح پر اسلام کے لیے انتہائی روشن امکانات چھپے ہوئے ہیں۔ آپ کی ربانی بصیرت نے آپ کو یہ بتایا کہ اگر کسی طرح جنگی حالات ختم کر دیے جائیں تو اندر کی تہہ میں چھپے ہوئے امکانات ابھر آئیں گے اور اسی جغرافیہ میں اسلام کی نئی تاریخ بننا شروع ہو جائے گی جہاں وہ بظاہر ختم ہوتی ہوئی نظر آرہی ہے۔

حالات کے اسی مطالعہ سے وہ چیز برآمد ہوئی جس کو صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ صلح حدیبیہ حقیقۃً مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان دس سال کا ناجنگ معاہدہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگی حالات کو ختم کرنے کے لیے یہ کیا کہ مشرکین کے ہر مطالبہ کو یک طرفہ طور پر منظور کر لیا۔ فریق ثانی جب ضد پر تلا ہوا ہو تو فریق اوّل کے لیے نارمل حالت پیدا کرنے کی ایک ہی صورت ہوتی ہے۔ یہ کہ وہ فریق ثانی کی ضد کو یک طرفہ طور پر مان لے۔

موجودہ زمانہ میں اسلام کی تاریخ دوبارہ اسی مقام پر پہونچ گئی ہے۔ جہاں وہ صلح حدیبیہ کے وقت ہجرت کے چھٹے سال پہونچی تھی۔ موجودہ زمانہ میں تقریباً پوری مسلم دنیا دوسری قوموں کے نفرت اور تشدد کا شکار ہو رہی ہے۔ مسلمان بھی اس کے خلاف ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ساری مسلم دنیا میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان

بے فائدہ لڑائیاں جاری ہیں۔ یہ لڑائی کہیں لفظی احتجاج کی صورت میں ہے اور کہیں ہتھیاروں کے استعمال کی صورت میں۔ بظاہر آج کی دنیا میں اسلام بے جگہ ہے۔ آج کی دنیا کے پاس اسلام کے لیے نفرت اور بیزاری کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو حقیقی صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ آج بھی عین وہی صورت حال ہے جو دور اوّل میں صلح حدیبیہ کے وقت تھی۔ اس کی ایک واضح علامت کثرت سے لوگوں کا اسلام قبول کرنا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مخالف اسلام حالات کے اندر موافق اسلام حالات چھپے ہوئے ہیں۔ اصل مسئلہ صرف ان مواقع سے فائدہ اٹھانے کا ہے۔ اگر ہم اس حکمت عملی کا ثبوت دے سکیں جو رسول اور اصحاب رسول نے صلح حدیبیہ کے وقت استعمال فرمائی تھی تو یقینی ہے کہ دوبارہ بہت بڑے پیمانہ پر وہی نتائج اسلام کے حق میں نکلیں گے جو دور اوّل میں صلح حدیبیہ کے بعد نکلے تھے۔

اس صورت حال کا فائدہ اٹھانے کے لیے ایک قربانی کی ضرورت ہے۔ کسی صورت حال (Situation) کو استعمال (Avail) کرنے کے لیے ہمیشہ قربانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج مسلمانوں کو یہی قربانی دینی ہے۔ یہ قربانی وہی ہے جو صلح حدیبیہ کے وقت رسول اور اصحاب رسول نے دی تھی۔ یعنی تمام جھگڑوں کو یک طرفہ طور پر ختم کر کے معتدل فضا پیدا کرنا۔

مسلمان آج تمام دنیا میں ردعمل کی نفسیات میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی مدعو قوموں سے قومی اور مادی جنگ چھیڑے ہوئے ہیں۔ یہی جنگ دعوت کی راہ میں اصل رکاوٹ ہے۔ اس کی وجہ سے داعی اور مدعو کا رشتہ حریف اور رقیب کے رشتہ میں تبدیل ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ دوسری اقوام سے اپنے تمام قومی اور سیاسی جھگڑوں کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیں۔ تاکہ داعی اور مدعو کا رشتہ بحال ہو۔ ان کے اور دوسری قوموں کے درمیان وہ معتدل فضا پیدا ہو جس میں آدمی دوسرے کی بات سنتا ہے اور اس پر کھلے ذہن کے ساتھ غور کرتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں ایک طرف وہ امکانات ہیں جو جدید تبدیلیوں کے نتیجے میں اسلام

کے حق میں پیدا ہوئے ہیں اور دوسری طرف کشمکش اور ٹکراؤ کی وہ فضا ہے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ساری دنیا میں جاری ہے۔ اس وقت مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت پر عمل کرنا ہے جو سنت چھٹی ہجری میں صلح حدیبیہ کی شکل میں ظاہر ہوئی تھی۔ یعنی غیر مسلم اقوام سے کشمکش اور ٹکراؤ کو یک طرفہ طور پر ختم کر دینا۔ غیر مسلم اقوام کی طرف سے ڈالی جانے والی تکلیفوں کو یک طرفہ طور پر پی جانا۔ اگر مسلمان اس قربانی کا حوصلہ کر سکیں تو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نفرت کی موجودہ فضا اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد جو چیز بچے گی وہ وہی دوسری چیز ہے جس کو ہم نے اسلامی دعوت کے جدید امکانات کہا ہے۔ نفرت کی فضا ختم ہوتے ہی نیچے کی تہہ میں چھپے ہوئے امکانات سامنے آجائیں گے۔

جس دن ایسا ہوگا اسی دن اسلام کی نئی تاریخ بننا شروع ہو جائے گی، ایک ایسی تاریخ جس کے لیے خدا نے مقدر کر دیا ہے کہ وہ اختتام تک پہونچنے سے پہلے کہیں نہ ٹھہرے۔

نیا دور

صلح حدیبیہ دس سال کا ناجنگ معاہدہ تھا۔ صلح حدیبیہ کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلوار الگ رکھ دی اور اسلام کی فکری طاقت کو استعمال کیا۔ یہ انسانی تاریخ میں پہلا واقعہ تھا کہ مقابلہ کو جنگ کے میدان سے نکال کر فکر کے میدان میں لایا گیا۔ اس وقت تک انسان صرف یہ جانتا تھا کہ دو مختلف گروہوں کے درمیان فیصلہ جنگ کے میدان میں ہوتا ہے۔ مگر خدا کے رسول نے اپنے عمل سے دکھایا کہ یہ فیصلہ فکر و نظریہ کے میدان میں بھی ہوتا ہے۔ اور فکر و نظریہ کے میدان میں ہونے والا فیصلہ جنگ کے میدان میں ہونے والے فیصلہ سے زیادہ کامیاب ہے۔

صلح حدیبیہ محض ایک وقتی تدبیر نہ تھی جو قدیم زمانہ کے قبیلۂ قریش سے نمٹنے کے لیے اختیار کی گئی۔ اس کی حیثیت اس سے زیادہ ہے۔ یہ انسانی تاریخ میں ایک نیا دروازہ کھولنا تھا۔ اس کے ذریعہ سے آپ نے ایک طرف اسلام کی ناقابل تسخیر فکری قوت کا مظاہرہ فرمایا۔ اور دوسری طرف تاریخ میں پہلی بار ایک نئے دور کا آغاز کیا جس کی تکمیل موجودہ زمانہ میں پہونچ کر ہوئی ہے۔

تمام قدیم زمانوں میں یہ ایک جائز بات سمجھی جاتی تھی کہ ایک حکمراں اپنی مسلح فوجوں کو لے کر دوسرے ملک میں داخل ہو جائے اور قتل و خوں ریزی کے ذریعہ اس پر قبضہ کر لے۔ یہ تمام تر ایک جدید ظاہرہ ہے کہ اس قسم کی جارحیت کو بین اقوامی جرم سمجھا جاتا ہے۔ اور بین اقوامی مسائل کو گفت و شنید کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

بین اقوامی زندگی میں ہتھیار کے بجائے نظریہ کا استعمال تمام تر پیغمبر اسلام کی دین ہے۔ موجودہ زمانہ کا یہ عالمی مزاج درحقیقت اس انقلابی لہر کی تکمیل ہے جو صلح حدیبیہ کی صورت میں چودہ سو سال پہلے شروع کی گئی تھی۔ پیغمبر اسلام نے سب سے پہلے قوموں کے درمیان یہ سوچ پیدا کی۔ پھر آپ نے اس اصول پر عمل کر کے اس کو ایک زندہ واقعہ کی حیثیت دے دی۔ اس کے بعد یہ طرز فکر تاریخی لہر میں شامل ہو گیا۔ وہ برابر بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ موجودہ فکری انقلاب کی صورت میں اپنی انتہا کو پہونچ گیا۔

تاریخ کا یہ انقلاب عین ہمارے حق میں ہے " حدیبیہ " کے وقت جو موقع وقتی صلح کے ذریعہ حاصل کیا گیا تھا، اب اس نے ایک پورے دور کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس انقلاب نے ہمارے لیے ہمیشہ سے زیادہ وسیع پیمانہ پر یہ امکان کھول دیا ہے کہ ہم ایک موافق فضا میں اسلام کی اشاعت کا کام کریں اور اسلام کی فکری طاقت کو استعمال کر کے دوبارہ اس کو دنیا کا غالب دین بنا دیں۔

دہلی یکم ستمبر ۱۹۸۵

سچائی کو پانے والا

معانی کی دنیا خدا کے جلووں کی دنیا ہے۔ کون ہے جو خدا کے جلووں کو انسانی زبان میں بیان کرسکے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں الفاظ ختم ہوجاتے ہیں وہاں سے معانی کا آغاز ہوتا ہے۔ ہم جب کسی معنی کو بیان کرتے ہیں تو ہم اس کو بیان نہیں کرتے بلکہ اس کو کچھ گھٹا دیتے ہیں۔ اس کے اوپر ایک لفظی پردہ ڈال دیتے ہیں۔

کسی باطنی حقیقت کو کوئی شخص محض اس کے الفاظ سے سمجھ نہیں سکتا۔ ایک اندھا شخص کسی کے بتانے سے یہ نہیں جان سکتا کہ پھول کیا ہے۔ اسی طرح ایک شخص جس نے معنوی حقائق کو دیکھنے کی صلاحیت اپنے اندر نہ جگائی ہو وہ معنوی حقائق سے باخبر نہیں ہوسکتا۔ خواہ ڈکشنری کے تمام الفاظ اس کے سامنے دہرا دیئے جائیں، خواہ قاموس المعانی کی تمام جلدوں کو اسے پڑھا دیا جائے۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ مگر اس کتاب سے ہدایت اسی کو ملتی ہے جو اپنے اندر تقویٰ کی صفت رکھتا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سچائی اس کو ملتی ہے جس کے دل میں سچائی کی کھٹک موجود ہو۔ جو شخص سچائی کی تلاش میں ہو، سچائی جس کی ضرورت بن گئی ہو، جو سچائی کو پانے کے لئے اتنا بے قرار ہو کہ وہ اسی کی یاد لے کر سوتا ہو اور اسی کی یاد لے کر جاگتا ہو، جو آدمی اس طرح سچائی کا طالب ہو، قرآن اسی کے لئے ہدایت بنتا ہے۔

ایسا شخص گویا ہدایت کا نصف راستہ طے کرچکا ہے۔ وہ اپنے اندر چھپے ہوئے عہد الست کی خدائی آوازوں کو سن رہا ہے۔ وہ اپنے اندر اس صلاحیت کو بیدار کرچکا ہے جو معانی زبان کو سمجھتی ہے۔ ایسا شخص مادی دنیا سے بے رغبتی کی وجہ سے عالم حقائق سے اتنا قریب آجاتا ہے کہ وہ فرشتوں کی سرگوشیوں کو سننے لگتا ہے۔

نبوت کا علم ملنے سے پہلے یہ تمام تجربات آدمی کے اندر مبہم اور مجہول انداز میں ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جب قرآن کی آواز اس کے اندر داخل ہوتی ہے تو وہ اس کی کتاب فطرت کی تفسیر بن جاتی ہے وہ اپنے اندر چھپے ہوئے غیر ملفوظ اشارات کو ملفوظ زبان میں پالیتا ہے۔ اب قرآن اور قرآن کو پڑھنے والا دونوں ایک دوسرے کا مثنیٰ بن جاتے ہیں۔ قرآن وہ بن جاتا ہے اور وہ قرآن۔

خبرنامہ اسلامی مرکز — ۳۵

۱۔ امریکی اخبار نیویارک سٹی ٹریبیون (New York City Tribune) کے نمائندہ مسٹر کٹل (Robert S. Kittel) ۱۲ اگست ۱۹۸۷ کو مرکز میں آئے اور اپنے اخبار کے لیے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو نیویارک سٹی ٹریبیون (۱۷ اگست ۱۹۸۷) میں چھپا ہے۔ ہندستان کی ۴۰ سالہ برسی کے موقع پر مذکورہ اخبار نے ہندستان سے متعلق ایک خصوصی رپورٹ شائع کی ہے۔ اس میں ہندو نقطۂ نظر، عیسائی نقطۂ نظر، مسلم نقطۂ نظر، سکھ نقطۂ نظر اور بدھسٹ نقطۂ نظر کے تحت ہر فرقہ کے ایک نمایاں شخص کا انٹرویو شامل ہے۔ مسلم نقطۂ نظر کے بارے میں اخبار نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو شائع کیا ہے۔ مسٹر کٹل نے صدر اسلامی مرکز کے نام اپنے خط مورخہ ۹ ستمبر ۱۹۸۷ میں لکھا ہے کہ آپ کی شرکت کے بغیر یقیناً ہماری یہ اشاعت نامکمل رہتی:

It certainly would have been incomplete without your contribution.

۲۔ مشہور انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (۱۵ ستمبر ۱۹۸۷) نے صدر اسلامی مرکز کا ایک مفصل مضمون نمایاں طور شائع کیا ہے۔ اس مضمون کا خلاصہ اس کے بعد آل انڈیا ریڈیو کے خبروں کے بلیٹن کے ساتھ بھی نشر کیا گیا۔

۳۔ آل انڈیا ریڈیو (اکسٹرنل سروس) نے صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ۷ ستمبر ۱۹۸۷ کو ریکارڈ کیا۔ اس انٹرویو کا موضوع ہندستانی مسلمان تھا۔ یہ انٹرویو آدھ گھنٹہ جاری رہا۔ وہ اولاً ۱۸ ستمبر اور دوسری بار ۲۴ ستمبر ۱۹۸۷ کو نشر کیا گیا۔

۴۔ نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام صاحب (مقیم اٹلی) الرسالہ کے باقاعدہ قاری ہیں۔ انھوں نے اپنے خطوط میں الرسالہ کے بلند معیار کا اعتراف کیا ہے۔ اپنے خط مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۷ کے ساتھ انھوں نے امریکہ کے دو پتے اور انگلینڈ کے دو پتے روانہ کیے ہیں اور اپنی طرف سے زر تعاون ادا کر کے ان کو الرسالہ انگریزی جاری کروایا ہے۔ یہ چاروں حضرات اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

۵- الرسالہ انگریزی کن حلقوں میں پھیل رہا ہے اور وہ کس قسم کے تاثرات پیدا کر رہا ہے، اس کو جاننے کے لیے یہاں ایک خط (۱۴ اکتوبر ۱۹۸۷) نقل کیا جاتا ہے :

Just today we received the September and October 87 copies of Al-Risala. I keep eagerly awaiting for the ensuing editions every time — so wonderful they are. Every page breathes of the universality, catholicity, breadth and wisdom of the Editor and the authors. Please accept our hearty congratulations for this noble attempt at a time when man hates man in the name of religion and builds narrow walls of communalism around himself. Please continue to send the copies regularly. We wish to preserve them for the reading public (14.10.1987)

Swami Abhiramananda, Sir Ramakrishna Ashrama
Bull Temple Road, Bangalore 560 019

۶- فرینک فرٹ جرمنی میں کتابوں کی ایک عالمی نمائش ۷ - ۱۲ اکتوبر ۱۹۸۷ کو ہوئی۔ اس موقع پر اسلامی مرکز کی انگریزی کتابیں ہندستانی پویلین پر بطور نمائش رکھی گئیں۔

۷- شری ستیہ سائیں سیوا آرگنائزیشن (ریلوے کالونی کشن گنج، دہلی) کی طرف سے ۳ اکتوبر ۱۹۸۷ کو ایک اجتماع تھا۔ ہندو عورتیں اور مرد اس میں شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز کو اس موقع پر شرکت کی دعوت دی گئی۔ وہ اس میں شریک ہوئے اور " اسلامی تعلیمات " کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ لوگوں نے تقریر کو پسند کیا اور مزید سننے کی خواہش ظاہر کی۔

۸- بہوجن سماج پارٹی کی طرف سے ۲۷ ستمبر ۱۹۸۷ کو کانسٹی ٹیوشن کلب (نئی دہلی) میں ایک سمینار ہوا۔ اس سمینار کا موضوع ہندستان کی مذہبی اقلیتوں کے مسائل پر غور کرنا تھا۔ منتظمین سمینار کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس سمینار میں شرکت کی اور مذکورہ موضوع پر ایک تقریر کی۔ اس تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمان اس ملک میں ایک قسم کا پروٹسٹنٹ گروپ بن کر رہ گیے ہیں۔ یہ ان کے مسئلہ کا حل نہیں۔ ان کے مسئلہ کا حل صرف یہ ہے کہ وہ اس ملک میں کری ایٹو گروپ بنیں۔ یہی ان کے مسئلہ کا واحد حل ہے۔

۹- گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں ۲ اکتوبر ۱۹۸۷ کو ایک اجتماع ہوا۔ اس میں تعلیم یافتہ

مسلمان شریک ہوئے ۔ صدر اسلامی مرکز نے قرآن و حدیث کی روشنی میں بتایا کہ اسلام کیا ہے اور موجودہ حالت میں احیاء ملت کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے ۔

۱۰۔ مجلہ البلاغ (کویت) کے نمائندہ محمد یاسر القضمانی نے ۸ اکتوبر ۱۹۸۷ کو صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کی اور البلاغ کے لیے ان کا انٹرویو لیا ۔ یہ انٹرویو ڈیڑھ درجن سوالات اور جوابات پر مشتمل تھا ۔ سوالات ذاتی نوعیت کی باتوں سے لے کر علمی اور ملی مسائل تک پھیلے ہوئے تھے ۔ دوران گفتگو انھوں نے اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ اسلامی مرکز کی مطبوعات کو جلد سے جلد عربی زبان میں منتقل ہونا چاہیے ۔

۱۱۔ اسلامی مرکز کے مشن کے تعارف کے لیے انگریزی اخبارات میں متعدد خطوط اور آرٹیکل شائع کرائے گیے ۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۵ ستمبر ۱۹۸۷) نے اسلامی مرکز کا ایک مفصل آرٹیکل شائع کیا ۔ اس کو بہت پسند کیا گیا ۔ اس کی اشاعت کے بعد مرکز میں کافی خطوط اور ٹیلی فون آئے ۔ لوگوں نے کہا کہ یہ بہت مفید سلسلہ ہے ۔ اس کو جاری رکھا جائے ۔ خود اخبار میں کافی خطوط موافق اور مخالف چھپتے رہے ۔ یہاں صرف ایک خط (مطبوعہ ٹائمس آف انڈیا ۶ اکتوبر ۱۹۸۷) کا ایک پیراگراف نقل کیا جاتا ہے :

Maulana Wahiduddin Khan (September 15) has given golden advice to Muslim Indians — to stop complaining and start creating. As long as there are men like Maulana Wahiduddin Khan in the Muslim community, there is hope for it.

K.R. Malkani, New Delhi. (*The Times of India*, October 6, 1987)

۱۲ ایک صاحب جو یورپ کے ایک ملک سے تعلق رکھتے ہیں ، انھوں نے ٹائمس آف انڈیا کا مذکورہ مضمون پڑھا ۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے خط (۳۰ ستمبر ۱۹۸۷) حسب ذیل الفاظ میں اپنے احساسات کا اظہار کیا ہے :

I was very interested to see the article printed in *The Times of India* (15-9-87). It is extremely encouraging that the message of *Al-Risala* is receiving nationwide dissemination and one can only hope that people hearken to it.

۱۳۔ الرسالہ کے بارہ میں بدگمانی میں صرف وہ لوگ رہتے ہیں جنھوں نے الرسالہ کو نہ پڑھا ہو۔

الرسالہ پڑھتے ہی ان کی غلط فہمی ختم ہوجاتی ہے۔ ایک صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں:
میں آپ کے ماہنامہ الرسالہ سے متنفر تھا۔ لیکن وہ میرا تعاقب کرتا رہا۔ بادلِ ناخواستہ ایک مرتبہ مطالعہ کے لیے اٹھایا تو عجیب ٹیسٹ ملا۔ پھر تو احباب سے لے کر برابر دیکھنے لگا۔ ہر مرتبہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ گرہیں کھلنے لگیں۔ اس کے مضامین دلوں میں پیدا ہونے والے گمراہ کن خیالات کا جواب نیز قلب و فکر کی تطہیر کے ساتھ اکتشافِ حق کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ یقیناً میری طرح ایسے بہت افراد ہوں گے جو منجمد ماحول اور مخصوص تربیت کی وجہ سے تقلیدی بدظنی کا شکار ہوں گے۔ اب برائے کرم مندرجہ ذیل پتہ پر اس کو جاری فرمادیں اور جواب میں مطلع کریں کہ الرسالہ کی فائلیں کیا دستیاب ہو سکتی ہیں (توحید احمد قاسمی، جونپور)

۱۴۔ الرسالہ کے مشن کو پھیلانے کے لیے ابھی بہت کم براہ راست کوشش کی جا سکی ہے۔ مگر یہ اللہ کا فضل خاص ہے کہ وہ اپنے آپ پھیل رہا ہے۔ ۱۰ جولائی ۱۹۸۷ کو ابوظبی سے ٹیلی فون آیا۔ ایک بزرگ (محمد اقبال صاحب) نے بتایا کہ وہ اسلامی مرکز کے مشن سے ناواقف تھے۔ اتفاقاً انھیں "خاتونِ اسلام" ملی۔ اس کو پڑھ کر وہ غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے ـــــــ اسی طرح ہر روز تحریری یا زبانی طور پر خبریں ملتی رہتی ہیں۔

۱۵۔ ایک صاحب دوحہ (قطر) سے لکھتے ہیں: الرسالہ کے دو شمارے دسمبر ۱۹۸۲ اور نومبر ۱۹۸۶ ایک دوست سے پڑھنے کو ملے۔ تمام مضامین آج کل کے ماحول کے عین مطابق ہیں۔ ایک بار الرسالہ پڑھنا شروع کرو تو چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ ایک ایک مضمون عصری اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ کتنا بھی زیادہ پڑھ جاؤ نگاہ پر کسی طرح کا بار محسوس نہیں ہوتا۔ سوئے ہوئے کو جگانا تو ایک عام سی بات ہے۔ لیکن جو جاگتے ہوئے بھی سوئے ہوئے ہوں ان کا جگانا ایک عام سی بات نہیں بلکہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ اسی کے مصداق ہیں۔ آپ سے التماس ہے کہ آپ جب سے الرسالہ جاری کیے ہوئے ہیں یعنی پہلے شمارہ سے لے کر آج تک سب ایک ایک عدد اور "عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر" کا مکمل سیٹ بذریعہ ہوائی ڈاک مجھے روانہ کردیں (محمد سعید)

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

AL-RISALA

Annual Subscription Rates:

	One year	Two year
INLAND	Rs. 48	Rs. 90
ABROAD (By air mail)	US $ 25	US $ 50
(By surface mail)	US $ 10	US $ 20

SUBSCRIPTION FORM

Please send me AL-RISALA

☐ Urdu ☐ English for ☐ 1 year ☐ 2 years

Name ....

Address ....

....

GIFT SUBSCRIPTION

Please send AL-RISALA to my friend/relative to the following address:
☐ Urdu ☐ English for ☐ 1 year ☐ 2 years I am enclosing cheque Postal Order/Bank Draft/M.O. Receipt No. ....

Name ....

Address ....

....

Please send this together with the payment to the Circulation Manager
AL-RISALA C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013 (India)

D(SE) 243 R.N. No. 28822/76

December 1987 No. 133